رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۲۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت فی پرچہ دس آنے

روپے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلی مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس سے پہلے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ پاکستان کے اصولاً دار الاسلام بن جانے کے بعد سے جماعت اسلامی جس لائحہ عمل پر کام کر رہی ہے اس کے بنیادی مقاصد کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم چار بڑے بڑے مقاصد کی نشان دہی کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ان میں سے پہلے دو مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہم اب تک کیا کچھ کرتے رہے ہیں اور آگے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اب ہمیں تیسرے اور چوتھے مقصد کی تشریح کرنی ہے۔

ہمارا تیسرا مقصد یہ ہے کہ "اس نئی مملکت کی تعمیر لازماً انہی بنیادوں پر ہو جو قرارداد مقاصد میں متعین کر دی گئی ہیں اور کسی ایسی تدبیر کو نہ چلنے دیا جائے جو قرارداد مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر یہاں ایک غیر اسلامی طرز کا نظام حکومت قائم کرنے کے لیے اختیار کی جائے۔"

اس کام کی اہمیت کیا اور کس قدر ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم قرارداد مقاصد کی اصلی قدر و قیمت کو اچھی طرح مشخص کریں۔ اس قرارداد سے پاکستان کی آئینی حیثیت میں جو تغیر ہوا ہے وہ درحقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ ملک اصولاً دار الاسلام بن گیا ہے۔ اس قرارداد سے تغیر نے وہ سب کچھ ہمیں نہیں دے دیا ہے جو ہمیں مطلوب تھا۔ ابھی ایک بہت بڑا کام باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس مملکت کو عملاً دار الاسلام بنایا جائے۔ تمثیل کے پیرائے میں اس کو یوں سمجھیے کہ قرارداد مقاصد تو محض ایک "کلمۂ شہادت" ہے جسے ادا کر کے ایک غیر مسلم نے قبول اسلام کا اعلان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی بڑی چیز ہے اور اس کے شرعی نتائج اپنی جگہ بڑے اہم ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مگر مجرد قبول اسلام سے وہ سب کچھ حاصل نہیں ہو جاتا ہے جو تبلیغ اسلام

کا مقصود ہے۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ جو شخص اسلام میں داخل ہوا ہے اس کے طریقِ فکر اور طرزِ زندگی میں بھی اسلام کے منشا کے مطابق تغیر ہو۔ وہ فرض کو فرض مانے اور اسے ادا کرے۔ حرام کو حرام جانے اور اس سے بچے، خدا اور رسول کے حکم کو اساسِ قانون تسلیم کرے اور اس کے آگے سر جھکا دے۔ شریعتِ خداوندی کی مقرر کی ہوئی حدوں کو پہچانے اور اپنے عمل کو ان کے اندر محدود کرے۔ یہ تغیرات جب تک اس کی زندگی میں نہ ہوں گے اس کی حالت اُس نومسلم کی سی ہو گی جو بس کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا ہو، باقی رہے خیالات، اخلاق اور اعمال، تو ان کے لحاظ سے وہ ویسا ہی غیر مسلم رہے جیسا کلمہ خوانی سے پہلے تھا۔ یہ حالت ظاہر ہے کہ کسی فرد کے معاملہ میں بھی قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتی، کجا کہ ایک مملکتِ اسلامیہ کے معاملہ میں قابلِ اطمینان ہو سکے۔ جہاں تک ایک غیر تحریری دستور رکھنے والی مملکت کا تعلق ہے، اس میں تو یہ تغیرات تدریجی "رواج" کی تبدیلی سے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک تحریری دستور رکھنے والی مملکت کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس کے دستور میں اُن تمام ضروری تغیرات کو واضح طور پر ثبت کیا جائے جو اِس "کلمہ خوانی" کی مناسبت سے اس کے نظام میں ہونے چاہئیں۔ اس کے بغیر نہ اس کا پچھلا طریقِ عمل بدل سکتا ہے اور نہ اسے اسلام کے مطابق کسی طریقِ عمل کا پابند بنایا جا سکتا ہے۔

یہ تو ہے وہ کام جو ابھی دارالاسلام کی تعمیرِ نو کے سلسلہ میں کرنا باقی ہے۔ اب دوسری طرف ذرا اُن حالات کو دیکھیے جن میں یہ باقی ماندہ کام انجام پانا ہے۔ ہم اس امرِ واقعی سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے کہ ہمارے اس ملک میں اسلام کی طرف رجحان خواہ کتنا ہی عام ہو، اس کا علم بہت کم ہے اور اسلامی طور طریقوں کی عملی تربیت کا تو اس سے بھی زیادہ فقدان ہے۔ ہماری سیاست کی زمامِ کار جس گروہ کے ہاتھ میں ہے اس کا پورا ذہنی نشوونما مغربی تعلیم اور مغربی ماحول میں ہوا ہے۔ ہمارے نظم و نسق کی مشینری جن ملازمینِ حکومت کے ذریعہ سے چل رہی ہے، انہوں نے آج تک جتنی بھی تربیت پائی ہے مغربی طرز پر ہی حکومت کا انتظام کرنے کی پائی ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جس کے شعور اور ارادے کی صحت اور جس کی فرض شناسی پر ہماری قومی زندگی کا مدار ہے، افسوس ناک حد تک دماغی انتشار

میں مبتلا ہے اور اگر کچھ تھوڑا بہت اسلامی شعور اُس میں پیدا ہوا بھی ہے تو ارادے کی کمزوری اور فرض سے غفلت نے اس کو بہت کچھ غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ رہے عوام جن کا ووٹ ایک جمہوری نظام میں بہرحال فیصلہ کن ہوتا ہے، تو وہ ہمارے ہاں ابھی نہ اس لائق ہیں کہ اسلامی دستور اور غیر اسلامی دستور کے فرق کو سمجھ سکیں، اور نہ ان کے اندر ابھی تک ایسی طاقت ور اور منظم رائے عام پیدا ہو سکی ہے کہ مملکت کی گاڑی کو غلط سمت میں جاتے دیکھ کر روک سکیں اور صحیح سمت کی طرف مڑنے پر مجبور کر سکیں۔ اس حالت میں اصولی دارالاسلام کو عملی دارالاسلام بنانے کا وہ عظیم الشان کام جو ابھی باقی ہے، اُس سے بہت زیادہ دشوار نظر آنے لگتا ہے جتنا بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے۔

یہ دشواری بھی شاید ہلکی ہی ہوتی اگر برسرِ اقتدار گروہ صرف اسلام سے ناواقفیت کا مریض ہوتا، اس سے فرار کی خواہش کا روگی نہ ہوتا۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز دردِ سر کی موجب ہو سکتی تھی تو وہ بس یہ کہ مغربی افکار و نظریات اور مغربی ریاستوں کے نظائر سے ان کی فریفتگی کیسے دُور کی جائے اور اسلامی مملکت کی دستوری خصوصیات کس طرح ان کے ذہن میں اتاری جائیں اور ایک نئی عمارت ایسے معماروں کے ہاتھوں کس طرح بنوائی جائے جو اس طرزِ تعمیر سے بالکل نابلد ہیں۔ مشکلات اتنی ہی ہوتیں تو انہیں رفع کرنے کے لیے سعیِ فرہاد درکار نہ ہوتی۔ لیکن یہاں معاملہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم اسے بھول نہیں سکتے کہ پاکستان بننے سے پہلے یہ لوگ اسلامی ریاست کے مفہوم اور تصور میں کیسا کچھ گھپلا کرتے رہے ہیں۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد مسلسل ۱۹ مہینے تک یہ کس طرح اسلامی ریاست کے سوال کو ٹالتے رہے اور اس سے بچنے کے لیے کیسی کیسی چالیں انہوں نے چلیں۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد کی کڑوی گولی کس بدمزگی کے ساتھ انہوں نے حلق سے اتاری۔ نہ یہ بھول سکتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد پاس کرنے کے بعد کوئی برائے نام تغیر بھی انہوں نے پچھلے ۳۰ مہینوں کے اندر اپنی حکومت کے طور طریق میں نہیں کیا جسے اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہو کہ انہوں نے یہ قرارداد نیک نیتی کے ساتھ منظور کی تھی۔ پھر وہ دستوری سفارشات تو ابھی پچھلے ہی سال ہمارے

سامنے آچکی ہیں جو ان حضرات نے ایک مدت کی کاوش کے بعد مرتب کی تھیں اور جن میں یہ لوگ بالکل بے نقاب ہو کر ایک سراسر غیر اسلامی دستور کا خاکہ لیے ہوئے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

ان سب باتوں کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اب جو مہم درپیش ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ سخت ہے جو قرارداد مقاصد کی منظوری سے پہلے درپیش تھی۔

ان حالات میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمارا پروگرام یہ ہے کہ:

ایک طرف اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں اور اس کی دستوری خصوصیات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی کوشش مسلسل جاری رکھی جائے، تاکہ تعلیم یافتہ طبقے کی ذہنی الجھنیں بھی دُور ہوں اور ہمارے دستور سازوں میں سے بھی جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ اس معاملہ میں روشنی حاصل کرنا چاہیں انہیں روشنی مل سکے۔ اس غرض کے لیے ہم نے ۱۹۵۰ء میں اپنے سابق لٹریچر پر "اسلامی ریاست" کے عنوان سے ایک اور سلسلے کا اضافہ کیا جس کے چار حصے "شہریت اور اس کے حقوق و فرائض"، "غیر مسلموں کے حقوق"، "کارکنوں کی ذمہ داریاں"، اور "اطاعت کے حدود و شرائط" کے نام سے اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں۔

دوسری طرف عوام الناس کو اسلامی ریاست کے تصور سے، قرارداد مقاصد کے مفہوم و مدعا اور اس کے تقاضوں سے، اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے معاملہ میں برسرِ اقتدار طبقہ کی کوتاہیوں سے پیہم آگاہ کیا جاتا رہے، تاکہ رائے عام اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ بیدار اور تیار ہو اور اس قرارداد کو پسِ پشت ڈال دینا یا اسے مکر و فریب کا شکار بنا لینا کسی کے لیے آسان نہ رہے۔ یہ کام مارچ ۱۹۴۹ء کے بعد سے مسلسل ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ اسے آئندہ بھی جاری رکھا جائیگا۔ البتہ اس میں حکمت اور اعتدال کے اِس تقاضے کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ایک بات کی اتنی زیادہ تکرار بھی نہ کی جائے کہ عام طبائع اس سے اُکتا جائیں اور اس کا اثر لینے کے بجائے اُلٹا اس سے استخفاف برتنے لگیں۔

تیسری طرف برسر اقتدار طبقے کے ہر اس قدم کی شدت سے مزاحمت کی جائے جو وہ قرارداد مقاصد کے منشا کے خلاف دستور بنانے کے لیے اٹھائے۔ پچھلے سال بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے جو سفارشات پیش کی تھیں، ان کی اشاعت کے بعد فوراً ہی ان پر تنقید کی گئی اور خدا کے فضل سے ملک کے تمام اسلامی رجحانات رکھنے والے طبقوں نے ہر قسم کے گروہی تعصبات کو نظر انداز کر کے پورے اتحاد کے ساتھ برسر اقتدار طبقے کے اس قدم کی مزاحمت کی۔ یہ ایک اچھا سبق تھا جو ان لوگوں کو دیا گیا، اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی جب کبھی وہ ایسی غلطی کریں گے، ان کو ایسا ہی سبق دیا جائے گا۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً یہ لوگ کوئی نہ کوئی ایسا شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں جس سے عوام الناس کی توجہ ملک کے بنیادی مسائل سے ہٹ کر کسی اندرونی یا بیرونی قضیے کی طرف مرتکز ہو جاتی ہے، اور اس سے فائدہ اٹھا کر یہ عارضی طور پر اپنا رنگ جما لیتے ہیں، لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی تائید سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی تدبیر انہیں یہ موقع کبھی نہ دے سکے گی کہ یہ اپنا من مانا دستور اس ملک پر مسلط کر سکیں۔

ہمارے لائحۂ عمل کے بنیادی مقاصد میں سے چوتھا اور آخری مقصد یہ ہے کہ "آئینی ذرائع سے اس مملکت کی موجودہ قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے اور اسے بروئے کار لا کر قوانین، نظم و نسق، تعلیم، مالیات، معاشی نظام، فلاح عمومی، دفاع، اور خارجی سیاست میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے پاکستان دنیا میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرنے والا ایک ملک بن جائے۔"

اس مقصد کو اور اس پروگرام کو جو اس کے لیے ہم نے اختیار کیا ہے، سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند مقدمات ذہن نشین کر لیے جائیں:۔

(۱) ہمارا اجتماعی نصب العین ایک مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف ہم خود ان تمام روحانی، اخلاقی اور مادی برکات سے متمتع ہوں جو اسلام میں

عطا کرتا ہے، اور دوسری طرف ہم اپنی قومی زندگی میں اسلامی عدل، اسلامی اخلاق، اور اسلامی نظامِ حیات کا ایسا مظاہرہ کریں جس سے تمام دنیا کے سامنے اسلام کے دینِ حق ہونے کی شہادت ادا ہو اور وہ مقصد پورا ہو جس کے لیے ہم ایک امت بنائے گئے ہیں، وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔

(۲) یہ نصب العین کسی طرح متحقق نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہمارے اجتماعی معاملات کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہو جو حکومت کی صلاحیت اور انتظام کی قابلیت رکھنے کے ساتھ اسلامی ذہنیت اور اسلامی سیرت بھی رکھتے ہوں اور یہ استعداد بھی اُن میں ہو کہ زمانہ جدید کی ایک ترقی یافتہ ریاست کا نظام اسلام کی ہدایت کے مطابق چلا سکیں۔

(۳) جہاں تک موجودہ قیادت کا تعلق ہے، اس کا کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ ان اوصاف سے متصف ہے۔ بلکہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس میں جو کچھ بھی اوصاف پائے جاتے ہیں وہ ان اوصافِ مطلوبہ کے عین برعکس ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے۔

(۴) اگر ملک میں حکومت کسی خاندان یا کسی طبقہ و گروہ کا اجارہ بن گئی ہو اور اسے تبدیل کرنے کے لیے کوئی آئینی طریقِ کار موجود ہی نہ ہو، تب تو مسلح انقلاب کی سعی ناگزیر ہے۔ لیکن اگر ملک میں ایک جمہوری نظام قائم ہو، اور اس میں آئینی طریقِ کار سے حکمرانوں کی تبدیلی کا کچھ بھی امکان باقی ہو تو پھر صحیح راستہ یہی ہے کہ عوام الناس کو فاسق قیادت اور صالح قیادت کے فرق سے آشنا کیا جائے، صالح قیادت کی طلب اور اس کی معرفت ان میں پیدا کی جائے، اسلامی طرز پر ملک کے انتظام کا ایک واضح پروگرام ان کے سامنے پیش کیا جائے، اور بتدریج ان کو اس لائق بنایا جائے کہ وہ اپنے اندر سے ایسے صالح آدمی چھانٹ لیں جو اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

(۵) جمہوری نظام میں بگاڑ کی اصلاح محض باتوں سے نہیں ہو جایا کرتی بلکہ اس کے لیے

برسوں کی منظم جدوجہد اور عرق ریزی و جانفشانی درکار ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں عوام الناس کے ووٹوں سے حکمران منتخب کیے جاتے ہوں وہاں اگر بگاڑ پایا جاتا ہے تو لامحالہ اس کا سرچشمہ چار ہی چیزیں ہونگی:

عوام الناس کی بے شعوری اور اخلاقی گراوٹ،

ایک ایسے بااثر طبقے کی موجودگی جو عوام کی اِن کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اقتدار کی مسندوں پر قبضہ جما رہا ہو، اور معاشرے میں ایسے متعدد عناصر کی موجودگی جو ان علمبرداران شر کے حامی و ناصر ہوں۔

نظم و نسق کی مشینری کا ایسے بے ضمیر اور نافرض شناس کارکنوں کے ہاتھ میں ہونا جو آئین کے حدود کو توڑ کر انتخابات میں بگاڑ کے علمبرداروں کی مدد کرتے ہوں، اور

انتخاب کے طریقِ کار میں ایسی بنیادی غلطیوں کا موجود ہونا جن کی وجہ سے صحیح انتخاب نہ ہو سکتا ہو۔

ان چاروں اسبابِ خرابی کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے تو اسے اِس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ جب تک یہ اسباب باقی ہیں، قیادت کبھی فساق و فجار کے ہاتھ سے نہیں نکل سکتی اور صالح نظام کبھی برپا نہیں ہو سکتا۔ پھر اسے اس امر میں بھی کوئی شبہ نہ رہے گا کہ انتخابات سے بے تعلق رہ کر محض تبلیغ و تلقین اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ سے نظامِ حق قائم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اسے اس امر میں بھی کوئی تردد نہ رہے گا کہ اصلاح جب بھی کرنی ہو، اسی طرح کرنی پڑے گی کہ براہ راست انتخابات میں دخل دیا جائے اور پیہم منظم کوشش اور حکیمانہ تدبیر کے ساتھ ان خرابیوں کی جڑیں کاٹی جاتی رہیں، یہاں تک کہ آخر کار عوام الناس صحیح طریقہ سے، صحیح مقصد کے لیے صحیح آدمی منتخب کرنے کے قابل ہو جائیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں اسلام برسرِ اقتدار آسکتا ہے

یہی کام ہے جو ہم نے پچھلے سال سے شروع کیا ہے۔ انتخاب کے طریقوں کی اصلاح کے

لیے جو پروگرام ہم نے اختیار کیا ہے وہ "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد" میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ ملکی انتظام کے مختلف شعبوں میں جو اصلاحات ہم چاہتے ہیں ان کا مفصل نقشہ ہم نے اپنے منشور میں پیش کر دیا ہے ـــ سردست چونکہ انتخابات صرف صوبوں میں ہو رہے ہیں، اس لیے ابھی ہم نے صرف یہ بتایا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی حدبندیوں کے اندر ایک صوبائی حکومت کے اختیارات سے کام لے کر اسلام کے منشا کے مطابق زندگی کے نظام میں کیا اصلاحات کی جا سکتی ہیں۔ آگے چل کر اگر کبھی مرکزی انتخابات کی نوبت آئی تو ہم انشاء اللہ یہ بھی بتائیں گے کہ پورے ملک کے نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کیا صورت ہے ـــ اِن دو چیزوں کو لے کر ہم رائے عام کی تربیت اور تنظیم کا کام اب عملاً کر رہے ہیں اور پہلی ہی انتخابی جدوجہد میں جو نتائج ہم نے حاصل کیے ہیں وہ ہماری مجلس شوریٰ کی روداد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس طریقے پر مسلسل کام کیا جاتا رہے تو رفتہ رفتہ عوام کی بے شعوری اور اخلاقی گراوٹ بھی دور ہو گی، ان کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے عناصر کا زور بھی ٹوٹے گا، حکومت کے نظم و نسق میں جس قدر بھی صاحب ضمیر اور فرض شناس عناصر موجود ہیں ان کی ہمدردیاں بھی ایماندار لوگوں کے ساتھ شامل ہوتی چلی جائیں گی اور ان کی مدد اور رائے عام کی تائید سے بالآخر اُن بے ایمانیوں کا سدباب کیا جا سکے گا جو انتخابات میں فساق کے سر کامیابی کا سہرا باندھا کرتی ہیں۔ اس کے بعد کہیں جا کر اس امر کا امکان پیدا ہو گا کہ یہاں اقتدار کی باگیں ان صالح انسانوں کے ہاتھ میں آئیں جو پورے اسلام کو اس کی اصلی شان کے ساتھ اس ملک میں نافذ کرنے والے ہوں

کوئی اللہ کا بندہ آنکھیں رکھتا ہو اور دیکھنا چاہتا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ دراصل ہمارا یہ آخری قدم نظامِ فسق و ضلال کے قلعے کی طرف براہِ راست پیش قدمی ہے اور ایک فیصلہ کن ضرب ہے جو ٹھیک اس کی فصیلوں پر جا کر پڑتی ہے۔ اگر ہم اپنے مقاصد میں سے صرف پہلے تین مقاصد کے لیے کام کریں، یا چوتھے مقصد کو بھی اپنے لائحہ عمل میں لے تو لیں مگر اسے حاصل کرنے کے لیے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۳۶ | ذی القعدہ و ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۱ء - | عدد ۵، ۶

انتخابات میں عملی حصہ نہ لیں، تو نہ قیادتِ فاسقہ کبھی ہٹ سکتی ہے اور نہ وہ قیادتِ صالحہ کبھی قائم ہوسکتی ہے جس کے قیام پر نظام اسلامی کا قیام منحصر ہے۔ یہ عملی انقلاب اگر رونما ہوسکتا ہے تو اسی آخری قدم سے ہوسکتا ہے جو ہم نے اب اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم نے یہ قدم نہ اُٹھایا تھا، کسی نہ کسی طرح ہمیں برداشت کیا جارہا تھا۔ مگر جونہی کہ یہ قدم ہم نے اٹھایا، قیادتِ فاسقہ اور اس کے مددگار سب کے سب یک لخت بھڑک اٹھے۔ پاکستان سے لیکر ہندوستان تک خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ پرانے پرانے دشمن، جو کبھی جمع نہ ہوسکتے تھے، اس خطرے کو آتے دیکھ کر متحد ہوگئے۔ دیوبند اور بریلی گلے مل گئے۔ پیروں اور وہابیوں میں اتحاد ہوگیا۔ اہل حدیث اور منکرین حدیث متفق ہوگئے۔ قادیانیوں اور احراریوں نے مل کر لیگ کا دامن تھام لیا۔ ہماری دس دس بارہ بارہ برس کی پرانی تحریروں میں سے وہ گمراہیاں ٹپکنی شروع ہوگئیں جو پہلے کبھی نظر نہ آئی تھیں یا دین کے لیے خطرہ نہ سمجھی گئی تھیں۔ ہندوستان کے کانگرسی علماء تک دینی حمیت کے تقاضوں سے مجبور ہوگئے کہ اپنے دارالافتاؤں کے گولہ بارود سے پاکستان مسلم لیگ کی مدد فرمائیں حد یہ ہے کہ مولانا محمد الیاس صاحب مرحوم کی جماعت کے بعض مشائخ کو بھی پہلی مرتبہ اسی وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ پوری خدا ترسی اور شانِ تواضع کے ساتھ جماعت اسلامی کی وہ ساری برائیاں گنوادیں جو ان کے خیالِ مبارک میں تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر لوگوں کو یقین نہ آئے کہ یہ قدم ہم نے ٹھیک صحیح رُخ پر اٹھایا ہے تو نہ معلوم اور کن علامات سے وہ حق کو پہچانیں گے ہمیں تو اس عام اضطراب میں شیطان کی اُس گھبراہٹ کے آثار صاف نظر آرہے ہیں جو اسلام کو اپنی آخری پناہ گاہ کے قریب آتے دیکھ کر اس پر طاری ہوا کرتی ہے۔

جس وقت یہ اوراق ناظرین کی نگاہوں سے گزر رہے ہونگے اُس کے بعد ہی انشاء اللہ متصلاً ارکان جماعت اسلامی کے پاس جماعت کے نئے دستور کا وہ مسودہ پہنچ جائے گا جس پر آئندہ نومبر کے اجتماع عام میں بحث ہونی ہے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس موقع پر اس

مجوزہ دستور کے متعلق چند امور کی توضیح کر دی جائے تاکہ رفقاء کو اس کے سمجھنے میں سہولت ہو اور اجتماعِ عام میں ہم کو ایسی بحثوں اور غیر ضروری ترمیموں سے سابقہ نہ پیش آئے جو محض دستور کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوں۔

ہمارا پچھلا دستور اب سے دس سال پہلے اُس وقت بنا تھا جب جماعت قائم ہوئی تھی۔ اُس وقت ہم نے صرف چند اصولی باتیں دستور میں درج کر دی تھیں اور تفصیلات کو قصداً چھوڑ دیا تھا، تاکہ تحریک اور نظام کی وسعت و ترقی کے ساتھ ساتھ جماعت کا ضابطۂ عمل خود بخود بنتا چلا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد، پچھلے دس سال کے دوران میں پوری جماعت اپنے مجموعی عملدرآمد سے بتدریج اپنا ایک دستور بناتی رہی ہے جو کہیں لکھا ہوا موجود نہیں ہے، بلکہ صرف جماعتی رواج اور جماعتی روایات کے اندر محفوظ ہے۔ جہاں تک جماعت کے کام کا تعلق ہے، وہ اب بھی کسی تحریری دستور کا محتاج نہیں ہے، اور آئندہ بھی ایک مدت تک توقع ہے کہ وہ اس کے بغیر چل سکتا ہے۔ لیکن کچھ دوسرے وجوہ ہیں جن کے باعث اب ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ جماعت کے پورے نظام اور ضابطۂ عمل کو واضح طور پر ایک دستور کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔

جماعت کی تحریک اب دعوتِ عام کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے اور اس موقع پر ہر وہ شخص جو جماعت سے روشناس ہوتا ہے، یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس جماعت کا نظام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نظامِ جماعت کو ہمارا ہر کارکن جماعت کی روایات کے حوالہ سے ہر شخص کے سامنے تو بیان نہیں کر سکتا۔ لامحالہ کوئی لکھی ہوئی چیز ہونی چاہیے جو کسی کو دی جا سکے۔

دعوتِ عام کے سلسلہ میں جماعت کو صرف خالی الذہن لوگوں یا ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والوں ہی سے سابقہ درپیش نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگوں سے بھی ہے جو اس کے خلاف تعصب یا عناد رکھتے ہیں۔ ان میں سے بکثرت لوگ غلط فہمی کی بنا پر یا قصداً جماعت کے نظام کی

غلط تعبیریں کرتے ہیں اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ یہ کوئی فسطائی طرز کی جماعت ہے یا کوئی خفیہ تحریک ہے، یا اس میں پاپائیت کا رنگ ہے، یا یہ کسی شخص خاص کے مریدوں کا گروہ ہے۔ اس طرح کی افترا پردازیوں کا سدِباب اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہمارا دستور کاغذ پر لکھا ہوا موجود ہو جسے ہر پڑھا لکھا آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ان پڑھ اپنے کانوں سے سن لے۔

جماعت کے نظام اور کام کو جو لوگ اس وقت چلا رہے ہیں وہ سب فانی ہیں اور حوادث کے شکار بھی ہو سکتے ہیں، مگر جماعت کو باقی رہنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یہ نظام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو اس جماعت کی روایات سے اچھی طرح واقف نہ ہوں اور ایک واضح دستورالعمل موجود نہ ہونے کی صورت میں ایسی غلطیاں کر جائیں جو جماعت کا حلیہ ہی بگاڑ دیں۔ اس لیے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جن لوگوں نے اب تک اس کام کو صحیح بنیادوں پر چلایا ہے وہ بعد کے آنے والوں کے لیے نظامِ جماعت کی شکل و صورت محفوظ کر دیں۔

ان وجوہ کے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے جس کی بنا پر نیا دستور مرتب کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارا پرانا دستور جو دستورِ جماعت اسلامی کے نام سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے وہ اب سے دس سال پہلے بالکل مختلف حالات میں مرتب ہوا تھا۔ اب ان حالات کے بدلنے کے بعد ناگزیر ہے کہ ہمارا نیا دستور بھی تحریری صورت میں شائع ہو جائے، ورنہ پرانے دستور کو دیکھ کر لوگ بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

اس دستوری مسودے کو ہماری مرکزی مجلسِ شوریٰ کی مقرر کی ہوئی ایک کمیٹی نے مرتب کیا ہے، اور اس کے بعد پھر مجلسِ شوریٰ ہی کی مقرر کی ہوئی ایک دوسری سب کمیٹی نے اس پر نظرِ ثانی کی ہے۔ اس میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ زیادہ تر اسی رواج کو جس پر اب تک جماعت کا نظام چلتا رہا ہے ضبطِ تحریر میں لے آیا جائے۔ حتی الامکان جماعت کے پچھلے رواج کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا ہے اور اس میں اگر کوئی جزوی ردوبدل کیا گیا ہے تو صرف ان مقامات پر جہاں جماعت کے پرانے کارکنوں

نے اپنے تجربات کی بنا پر اصلاح کی، یا مختلف رواجوں کو ختم کر کے ایک مقرر ضابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے، یا کسی ایسے دستوری مسئلے کا واضح جواب دینا ضروری سمجھا ہے جو آگے جماعت کو پیش آسکتا ہے اور جس کا کوئی جواب ہمارے اب تک کے دستوری رواج میں موجود نہیں ہے۔ تاہم کچھ چیزیں اس دستور میں نئی بھی ہیں جن سے اب تک ہمارے رفقاء جماعت آشنا نہ تھے۔ ہم ان کی طرف خاص طور پر رفقاء کو اس لیے توجہ دلا رہے ہیں کہ وہ خصوصیت کے ساتھ ان نکات پر زیادہ غائر نگاہ ڈالیں اور ان کے بارے میں ایک سوچی سمجھی رائے قائم کر کے آئیں۔

ان دستوری تجاویز میں اسلام کے شورائی نظام کے اصول، مزاج اور روح کو سمجھ کر اپنے نظام جماعت کی ضروریات پر ان کو منطبق کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس میں دو باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک یہ کہ جن دستوری نکات کے بارے میں کوئی واضح نص موجود ہے، ان میں نص کی پوری پابندی کی جائے۔ دوسرے یہ کہ جن دستوری نکات کا کوئی قطعی فیصلہ نص میں نہیں کیا گیا ہے ان میں متعدد مباح صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لی جائے جو ہمارے جماعتی نظام اور ہمارے موجودہ حالات کے لحاظ سے موزوں ترین ہو۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے، اس میں تو کوئی ردو بدل کرنے کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ البتہ دوسری قسم کے معاملات میں تمام ارکان جماعت کو غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ تجاویز درست ہیں جو مجوزہ دستور میں درج کی گئی ہیں، یا وہ اپنے پاس ان سے بہتر کچھ تجاویز رکھتے ہیں۔

مثلاً یہ بات منصوص ہے کہ جماعتی زندگی میں تمام اہم معاملات کا فیصلہ مشورے سے کیا جائے۔ اس چیز کی پابندی پر ہم مجبور ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مجوزہ دستور میں اوپر سے نیچے تک نظام جماعت کے ہر درجے میں مشورے کو لازم کیا گیا ہے۔ لیکن مشورے کا کوئی تفصیلی ضابطہ منصوص نہیں ہے۔ اس کی بہت سی صورتیں ممکن اور مباح ہیں۔ خلافت راشدہ میں جو صورتیں اختیار کی گئی

تھیں وہ سب بھی منصوص نہ تھیں، بلکہ چند مباح صورتوں کو وقت کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے اختیار کر لیا گیا تھا۔ ہمارے لیے بالکل جائز ہے کہ اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ہم کچھ دوسری مباح صورتیں اختیار کر لیں۔ خلافت راشدہ میں کچھ مخصوص اسباب کی وجہ سے اہل حل و عقد آپ سے آپ معلوم تھے۔ اس وقت ان کے انتخاب کی حاجت نہ تھی۔ اب ہم اپنی ضروریات کے لحاظ سے اہل شوریٰ کے انتخاب کا ایک ضابطہ تجویز کر سکتے ہیں۔ آپ اس ضابطہ کے لیے نص نہ تلاش کریں، بلکہ یہ دیکھیں کہ بہت سی ممکن و مباح صورتوں میں سے جو صورت مسودے میں تجویز کی گئی ہے آیا وہی مناسب ہے یا آپ کی رائے میں کوئی دوسری صورت اس سے مناسب تر ہے؟ اسی طرح مجلس شوریٰ کے لیے جو آئینی طریق کار تجویز کیا گیا ہے اس کی بیش تر تفصیلات بھی مباحات کے قبیل سے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کے بجائے دوسری متبادل صورتیں مباحات میں سے سوچ سکتے ہیں مگر کسی تجویز کو نہ اس بنا پر رد کر دیجیے کہ یہ طریقہ خلافت راشدہ میں رائج نہ تھا، اور نہ کسی دوسری تجویز پر صرف اس لیے اصرار کیجیے کہ یہی طریقہ اس زمانہ میں رائج تھا۔ البتہ آپ کو یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارے لیے ان مباح طریقوں میں سے کونسا طریقہ مناسب ہے جو اسلامی نظام کے شورائی مزاج سے قریب ترین مناسبت بھی رکھتا ہو اور ہمارے حالات و ضروریات کے لحاظ سے بھی موزوں ترین ہو۔

یا مثلاً امارت کے باب میں جو کچھ نص سے ثابت ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر اجتماعی ہیئت ایک امیر یا امام کے تحت امر ہونی چاہیے، اور اس کو زمام کار سونپنے کے بعد اس کی اطاعت فی المعروف ہونی چاہیے۔ نیز یہ اصول بھی نصوص کے اشارات اور صدر اول کے تعامل سے ثابت ہے کہ یہ صاحب امر جماعت کا معتمد علیہ ہونا چاہیے اور اسے اسی وقت تک صاحب امر رہنا چاہیے جب تک اسے جماعت کا اعتماد حاصل رہے۔ ان اصولی باتوں میں ہم کوئی رد و بدل نہیں کر سکتے۔ اب رہے یہ سوالات کہ امیر جماعت کا انتخاب بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ؟

طریقِ انتخاب کیا ہو؟ انتخاب کسی مدت کے لیے ہو یا بلاتعین مدت؟ امیر کو کن حالات میں معزول کیا جاسکتا ہے اور اس کا ضابطہ کیا ہے؟ امیر اور شوریٰ میں اختلافات کی مختلف ممکن صورتوں کا کیا حل ہے؟ جماعت کا اعتماد کھودینے کی صورت میں امیر اور مجلس شوریٰ، دونوں میں سے ہر ایک کو کیا کرنا چاہیے؟ اور امیر کے اختیارات کن حدود سے محدود ہونے چاہئیں؟ یہ اور اس طرح کے متعدد دوسرے دستوری سوالات اُن اُمور میں سے ہیں جن میں شریعت نے ہم کو کسی ایک طریقِ کار کا پابند نہیں کردیا ہے۔ اس لیے ہم بہت سی مباح صورتوں میں سے کسی ایک کو اپنے حالات وضروریات کے لیے موزوں ترین دیکھ کر اختیار کر سکتے ہیں۔ رفقاء جماعت کو چاہیے کہ اسی نقطۂ نظر سے ان سوالات کے جوابات مجوزہ دستور میں تلاش کریں اور ان پر غور کر کے رائے قائم کریں کہ آیا کسی سوال کا اس سے بہتر جواب ان کی نگاہ میں ہے؟

مجوزہ دستور پر غور کرتے وقت رفقاء کو تین چار باتیں اور بھی ذہن میں رکھنی چاہئیں:۔

اول یہ کہ جماعت کے ارکان اور کارکنوں کا جو اخلاقی معیار اس وقت ہے، صرف اسی کو سامنے رکھ کر نہ سوچیں بلکہ ایسے حالات کو بھی نگاہ میں رکھیں جبکہ خدانخواستہ اس معیار میں کچھ تنزل رونما ہوجائے۔ اس امکان کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ غور کرنا چاہیے کہ جو احتیاطی تدابیر اس دستور میں تجویز کی گئی ہیں وہ کس حد تک کافی اور مناسب ہیں۔ امکانات کا یہ پہلو نگاہ میں نہ رہنے سے اندیشہ ہے کہ ہمارے بہت سے رفقاء کو متعدد احتیاطی تدابیر جماعت کی موجودہ حالت کے لحاظ سے غیر ضروری محسوس ہوں گی۔

دوم یہ کہ "طریقِ کار" کے عنوان سے جماعت کی جس پالیسی کو مجوزہ دستور میں واضح کیا گیا ہے اس کا بڑا حصہ اصولاً صرف اُن حالات سے تعلق رکھتا ہے جبکہ ملک کے سیاسی نظام میں جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرنا کسی درجہ میں بھی ممکن ہو۔ ان حالات کے بدل جانے کی صورت میں طریقِ کار کے متعدد اجزاء پر نظرِ ثانی کی جاسکتی ہے، مگر اس کی فی الوقت کوئی ضرورت

نہیں ہے۔

سوم یہ کہ اس جماعت کی حیثیت بعینہٖ "امت" کی سی نہیں ہے بلکہ امت کے اندر ایک ایسی جماعت کی سی ہے جو فریضۂ اقامتِ دین سے امت کی عام غفلت کو دیکھ کر اس لیے منظم کی گئی ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے خود کوشش کرے اور بتدریج پوری امت کو اپنی اس کوشش میں شریک کر لے۔ اسی بنا پر رکنیت کی شرطیں، ارکان کے فرائض، ارکان کے حقوق، اور جماعت سے ارکان کی علیحدگی کے بارے میں آپ کو متعدد ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو "رکن جماعتِ اسلامی" اور "فردِ ملت" کی حیثیتوں کو خلط ملط کر دینے کی صورت میں وجہِ پریشانی بن سکتی ہیں۔ لہٰذا اس اختلاطِ حیثیات سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

چہارم یہ کہ اس جماعت کے اصول اور مزاج کو دنیا کی دوسری جماعتوں کے اصول اور مزاج سے کوئی مناسبت نہیں ہے، اس لیے اس کے دستوری خاکے پر غور کرتے ہوئے دوسری جماعتوں کے دستوری طریقے آپ بھول ہی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر ان کی نظیریں آپ کے ذہن میں گھومتی رہیں گی تو قدم قدم پر آپ کو الجھنیں پیش آئیں گی۔ اسلام میں جمہوریت تو ضرور ہے، مگر یہ دوسروں کی مقلّد جمہوریت نہیں ہے بلکہ اپنے اصول اور مزاج میں مستقل اور منفرد ہے۔

تفہیم القرآن

النحل (۲)

(تم ہر برسات میں دیکھتے ہو کہ) اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور یکایک مردہ پڑی ہوئی زمین میں اس کی بدولت جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لئے[۱]۔
تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ اُن کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ[۲]، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔

---

[۱] یعنی یہ منظر ہر سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے کہ زمین بالکل چٹیل میدان پڑی ہوئی ہے، زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں، نہ گھاس پھونس ہے، نہ بیل بوٹے، نہ پھول پتی، اور نہ کسی قسم کے حشرات الارض۔ اتنے میں بارش کا موسم آگیا اور ایک دو چھینٹے پڑتے ہی اسی زمین سے زندگی کے چشمے ابلنے شروع ہوگئے۔ زمین کی تہوں میں دبی ہوئی بے شمار جڑیں یکایک جی اٹھیں اور ہر ایک کے اندر سے وہی نباتات پھر برآمد ہوگئی جو پچھلی برسات میں پیدا ہونے کے بعد مر چکی تھی۔ بے شمار حشرات الارض جن کا نام و نشان تک گرمی کے زمانے میں باقی نہ رہا تھا، یکایک پھر اسی شان سے نمودار ہوگئے جیسے پچھلی برسات میں دیکھے گئے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی زندگی میں بار بار تم دیکھتے رہتے ہو، اور پھر بھی تمہیں نبی کی زبان سے یہ سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کریگا۔ اس حیرت کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمہارا مشاہدہ بے عقل حیوانوں کا سا مشاہدہ ہے۔ تم کائنات کے کرشموں کو تو دیکھتے ہو، مگر ان کے پیچھے خالق کی قدرت اور حکمت کے نشانات نہیں دیکھتے۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ نبی کا بیان سن کر تمہارا دل نہ پکار اٹھتا کہ فی الواقع یہ نشانیاں اس کے بیان کی تائید کر رہی ہیں۔

[۲] "گوبر اور خون کے درمیان" کا مطلب یہ ہے کہ جانور جو غذا کھاتے ہیں اس سے ایک طرف تو خون بنتا ہے، اور دوسری طرف فضلہ۔ مگر انہی جانوروں کی صنف اناث میں اسی غذا سے ایک تیسری (باقی ص ۲۹ پر)

کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی[1]۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے۔

تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی[2] کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹) چیز بھی پیدا ہوتی ہے جو خاصیت، رنگ و بو، فائدے اور مقصد میں ان دونوں سے بالکل مختلف ہے بالخصوص خاص طور پر مویشیوں میں اس چیز کی پیداوار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی ضرورت پوری کرنے کے بعد انسان کے لیے بھی یہ بہترین غذا کثیر مقدار میں فراہم کرتے رہتے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا:

[1] اس میں ایک ضمنی اشارہ اس مضمون کی طرف بھی ہے کہ پھلوں کے اس عرق میں وہ مادہ بھی موجود ہے جو انسان کے لیے حیات بخش غذا بن سکتا ہے، اور وہ مادہ بھی موجود ہے جو سڑ کر الکحل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی قوتِ انتخاب پر منحصر ہے کہ وہ اس سرچشمے سے پاک رزق حاصل کرتا ہے یا عقل و خرد زائل کر دینے والی شراب۔ ایک اور ضمنی اشارہ شراب کی حرمت کی طرف بھی ہے کہ وہ پاک رزق نہیں ہے۔

[2] وحی کے لغوی معنی ہیں خفیہ اور لطیف اشارے کے جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی اور محسوس نہ کر سکے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ اِلقاء (دل میں بات ڈال دینے) اور الہام (مخفی تعلیم و تلقین) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب و درسگاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بظاہر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پاتا نظر نہیں آتا، اس لیے اس کو قرآن میں وحی، الہام اور القاء کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظ وحی، انبیاء کے لیے مخصوص ہو گیا ہے، الہام کو اولیاء اور بندگانِ خاص کے لیے خاص کر دیا گیا ہے، اور القاء نسبتہً عام ہے۔ لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا۔ یہاں آسمانوں پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق ان کا سارا نظام چلتا ہے (وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا۔ حٰم السجدہ)۔ زمین پر بھی وحی ہوتی ہے جس کا اشارہ پاتے ہی وہ اپنی سرگزشت سنانے لگتی ہے (یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا۔ الزلزال)۔ ملائکہ پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق وہ کام کرتے ہیں (اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَةِ اَنِّیْ مَعَکُمْ۔ الانفال)، شہد کی مکھی کو اس کا پورا کام (باقی صفحہ ۲۹۱ پر)

ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ لے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰) وحی (فطری تعلیم) کے ذریعہ سے سکھایا جاتا ہے جیسا کہ آیت زیر بحث میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی تک ہی محدود نہیں ہے۔ مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دودھ پینا بھی وحی خداوندی ہی سکھایا کرتی ہے۔ پھر ایک انسان کو غور و فکر اور تحقیق و تجسس کے بغیر جو صحیح تدبیر، یا صائب رائے، یا فکر و عمل کی صحیح راہ سجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے (وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْہِ القصص) اور اس وحی سے کوئی انسان بھی محروم نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے اکتشافات ہوئے ہیں، جتنی مفید ایجادیں ہوئی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاتحین، مفکرین اور مصنفین نے جو معرکے کے کام کیے ہیں، ان سب میں اس وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آئے دن اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی بیٹھے بیٹھے دل میں ایک بات آئی، یا کوئی تدبیر سوجھ گئی، یا خواب میں کچھ دیکھ لیا۔ اور بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو غیب سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔ ان بہت سی اقسام میں سے ایک خاص قسم کی وحی وہ ہے جس سے انبیاء علیہم السلام نوازے جاتے ہیں اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیے جانے والے کو پورا شعور ہوتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے آرہی ہے اسے اس کے من جانب اللہ ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ عقائد اور احکام اور قوانین اور ہدایات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعہ سے نوع انسانی کی رہنمائی کرے۔

لے "رب کی ہموار کی ہوئی راہوں" کا اشارہ اس پورے نظام اور طریق کار کی طرف ہے جس پر شہد کی مکھیوں کا ایک گروہ کام کرتا ہے۔ ان کے چھتوں کی ساخت، ان کے گروہ کی تنظیم، ان کے مختلف کارکنوں کی تقسیم کار، ان کی فراہمی غذا کے لیے پیہم آمد و رفت، ان کا باقاعدگی کے ساتھ شہد بنا بنا کر ذخیرہ کرتے جانا، یہ سب وہ راہیں ہیں جو ان کے عمل کے لیے ان کے رب نے اس طرح ہموار کر دی ہیں کہ انہیں کبھی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس ایک مقرر نظام ہے جس پر ایک لگے بندھے طریقے پر تشکر کے یہ بے شمار چھوٹے چھوٹے کارخانے ہزارہا برس سے کام کیے چلے جا رہے ہیں۔

اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔[1] یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔[2]

[1] شہد کا ایک مفید اور لذیذ غذا ہونا تو ظاہر ہے، اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ اس کے اندر شفا ہونا نسبتہً ایک مخفی بات ہے اس لیے اس پر متنبہ کر دیا گیا۔ شہد اول تو بعض امراض میں بجائے خود مفید ہے، کیونکہ اس کے اندر پھولوں اور پھلوں کا رس، اور ان کا گلوکوز اپنی بہترین شکل میں موجود ہوتا ہے۔ پھر شہد کا یہ خاصہ کہ وہ خود بھی نہیں سڑتا اور دوسری چیزوں کو بھی اپنے اندر ایک مدت تک محفوظ رکھتا ہے، اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ دوائیں تیار کرنے میں اس سے مدد لی جائے۔ چنانچہ الکوہل سے پہلے دنیا کے فنِ دوا سازی میں وہ صدیوں اسی غرض کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ مزید براں شہد کی مکھی اگر کسی ایسے علاقے میں کام کرتی ہے جہاں کوئی خاص جڑی بوٹی کثرت سے پائی جاتی ہو تو اس علاقے کا شہد محض شہد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس جڑی بوٹی کا بہترین جوہر بھی ہوتا ہے اور اُس مرض کے لیے مفید ہوتا ہے جس کی دوا اُس جڑی بوٹی میں خدا نے پیدا کی ہے۔ شہد کی مکھی سے یہ کام اگر باقاعدگی سے لیا جائے، اور مختلف نباتی دواؤں کے جوہر اس سے نکلوا کر ان کے شہد علیحدہ علیحدہ محفوظ کیے جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ یہ شہد لیبارٹریوں میں نکالے ہوئے جوہروں سے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

[2] اس پورے بیان سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے دوسرے جُز کی صداقت ثابت کرنا ہے۔ کفار و مشرکین دو ہی باتوں کی وجہ سے آپ کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ آپ آخرت کی زندگی کا تصور پیش کرتے ہیں جو اخلاق کے پورے نظام کا نقشہ بدل ڈالتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ صرف ایک اللہ کو معبود اور مطاع اور مشکل کشا و فریاد رس قرار دیتے ہیں جس سے وہ پورا نظامِ زندگی غلط قرار پاتا ہے جو شرک یا دہریت کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہو۔ دعوتِ محمدی کے انہی دونوں اجزاء کو برحق ثابت کرنے کے لیے یہاں آثارِ کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بیان کا مدعا یہ ہے کہ اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، یہ آثار جو ہر طرف پائے جاتے ہیں نبی کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں یا تمہارے اوہام و تخیلات کی؟ نبی کہتا ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ تم اسے ایک اَن ہونی بات قرار دیتے ہو۔ مگر زمین ہر بارش کے موسم میں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اعادۂ خلق نہ صرف ممکن ہے بلکہ روز تمہاری آنکھوں کے سامنے (باقی ص ۲۹۳ پر)

اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر وہی تم کو موت دیتا ہے[1]۔ اور تم میں سے کوئی بد ترین عمر کو پہنچ جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے[2]۔ حق یہ ہے کہ اللہ ہی علم میں بھی کامل ہے اور قدرت میں بھی ؏

دغور کرو، اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں جو فضیلت عطا کر رکھی ہے تو ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جنہیں فضیلت دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں تاکہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں پھر کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں

(بقیہ حاشیہ ص ۲۹۲) ہو رہا ہے۔ نبی کہتا ہے کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے۔ تمہارے دہریے اس بات کو ایک بے ثبوت دعویٰ قرار دیتے ہیں۔ مگر مویشیوں کی ساخت، کھجوروں اور انگوروں کی بناوٹ اور شہد کی مکھیوں کی خلقت گواہی دے رہی ہے کہ ایک حکیم اور رب رحیم نے ان چیزوں کو ڈیزائن کیا ہے، ورنہ کیونکر ممکن تھا کہ اتنے جانور اور اتنے درخت اور اتنی مکھیاں مل جل کر انسان کے لیے ایسی ایسی نفیس اور لذیذ اور مفید چیزیں اس باقاعدگی کے ساتھ پیدا کرتی رہتیں۔ نبی کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی تمہاری پرستش اور حمد و ثنا اور شکر و وفا کا مستحق نہیں ہے۔ تمہارے مشرکین اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اپنے بہت سے معبودوں کی نذر و نیاز بجا لانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مگر تم خود ہی بتاؤ کہ یہ دودھ اور یہ کھجوریں اور یہ انگور اور یہ شہد، جو تمہاری بہترین غذائیں ہیں، خدا کے سوا اور کس کی بخشی ہوئی نعمتیں ہیں؟ کس دیوی یا دیوتا یا ولی نے تمہاری رزق رسانی کے لیے یہ انتظامات کیے ہیں؟

[1] یعنی حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تمہاری پرورش اور رزق رسانی کا سارا انتظام اللہ کے ہاتھ میں ہے بلکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ تمہاری زندگی اور موت، دونوں اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے کا اختیار رکھتا ہے نہ موت دینے کا۔

[2] یعنی یہ علم جس پر تم نازکرتے ہو اور جس کی بدولت ہی زمین کی دوسری تمام مخلوقات پر تم کو شرف حاصل ہے، یہ بھی خدا کا بخشا ہوا ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے یہ عبرتناک منظر دیکھتے رہتے ہو کہ جب کسی انسان کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ لمبی عمر دے دیتا ہے تو وہی شخص جو کبھی جوانی میں دوسروں کو عقل سکھاتا تھا، کس طرح گوشت کا ایک لوتھڑا بن کر رہ جاتا ہے جسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا

کو انکار ہے؟؎

؎ زمانۂ حال میں اس آیت سے جو عجیب و غریب معنی نکالے گئے ہیں وہ اس امر کی بدترین مثال ہیں کہ قرآن کی آیات کو ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ایک ایک آیت کے الگ معنی لینے سے کیسی کیسی الطائل تاویلوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ لوگوں نے اس آیت کو اسلام کے فلسفۂ معیشت کی اصل ٹھیرایا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا منشا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے رزق میں فضیلت عطا کی ہو انہیں اپنا رزق اپنے نوکروں اور غلاموں کی طرف ضرور لوٹا دینا چاہیے، اگر نہ لوٹائیں گے تو اللہ کی نعمت کے منکر قرار پائیں گے۔ حالانکہ اس پورے سلسلۂ کلام میں فلسفۂ معیشت کے بیان کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ اوپر سے تمام تقریر شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات میں ہوتی چلی آرہی ہے اور آگے بھی مسلسل یہی مضمون چل رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ میں یکایک فلسفۂ معیشت کی ایک دفعہ بیان کر دینے کا آخر کونسا تُک ہے؟ آیت کو اس کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بالکل برعکس مضمون بیان ہو رہا ہے۔ یہاں استدلال یہ کیا گیا ہے کہ تم خود اپنے مال میں اپنے غلاموں اور نوکروں کو جب برابر کا درجہ نہیں دیتے ـــــ حالانکہ یہ مال خدا کا دیا ہوا ہے ـــــ تو آخر کس طرح یہ بات تمہاری عقل میں سماتی ہے کہ خدا جو بذاتِ خود ہر چیز کا مالک ہے، اس نے اپنی مخلوقات میں سے بعض کو اپنی خدائی میں حصہ دار بنا لیا ہوگا؟

ٹھیک یہی استدلال، اسی مضمون سے سورۂ روم (رکوع ۴) کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ وہاں اس کے الفاظ یہ ہیں: ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ، كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ "اللہ تمہارے سامنے ایک مثال خود تمہاری اپنی ذات سے پیش کرتا ہے۔ کیا تمہارے اُس رزق میں جو ہم نے تمہیں دیے ہیں تمہارے غلام تمہارے شریک ہیں حتیٰ کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں؟ اور تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنے برابر والوں سے ڈرا کرتے ہو؟ اس طرح اللہ کھول کھول کر نشانیاں پیش کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔" دونوں آیتوں کا تقابل کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی مقصد کے لیے ایک ہی مثال سے استدلال کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسری کی تفسیر کر رہی ہے۔ (باقی صفحہ ۲۹۵ پر)

اللہ ہی نے تمہارے لیے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمہیں کھانے کو دیں۔ پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں[۶۳] اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں[۶۴] اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۴) شاید لوگوں کو غلط فہمی اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ انہوں نے تمثیل کے بعد متصلاً یہ فقرہ دیکھ کر خیال کیا کہ ہو نہ ہو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اپنے زیردستوں کی طرف رزق نہ پھیر دینا اللہ کی نعمت کا انکار ہے۔ حالانکہ جو شخص قرآن میں کچھ بھی نظر رکھتا ہے وہ اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا شکریہ غیر اللہ کو ادا کرنا اس کتاب کی نگاہ میں اللہ کی نعمتوں کا انکار ہے۔ یہ مضمون اس کثرت سے قرآن میں دہرایا گیا ہے کہ تلاوت و تدبّر کی عادت رکھنے والوں کو تو اس میں اشتباہ پیش نہیں آسکتا، البتہ انڈکسوں کی مدد سے اپنے مطلب کی آیات نکال کر مضامین تیار کرنے والے حضرات اس سے ناواقف ہو سکتے ہیں۔

نعمتِ الٰہی کے انکار کا یہ مفہوم سمجھ لینے کے بعد اس فقرے کا یہ مطلب صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ جب یہ لوگ مالک اور مملوک کا فرق خوب جانتے ہیں، اور خود اپنی زندگی میں ہر وقت اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں، تو کیا پھر ایک اللہ ہی کے معاملہ میں انہیں اس بات پر اصرار ہے کہ اُس کے بندوں کو اس کا شریک و سہیم ٹھیرائیں اور جو نعمتیں انہوں نے اُس سے پائی ہیں اُن کا شکریہ اُس کے بندوں کو ادا کریں۔

[۶۳] "باطل کو مانتے ہیں" یعنی یہ بے بنیاد اور بے حقیقت عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کی قسمتیں بنانا اور بگاڑنا ان کی مرادیں بر لانا اور دعائیں سننا، انہیں اولاد دینا، ان کو روزگار دلوانا، ان کے مقدمے جتوانا، اور انہیں بیماریوں سے بچانا کچھ دیویوں اور دیوتاؤں اور جنوں اور ولیوں کے اختیار میں ہے۔

[۶۴] اگرچہ مشرکین مکہ اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ ہی کی دی ہوئی ہیں، اور ان نعمتوں پر اللہ کا احسان ماننے سے بھی انہیں انکار نہ تھا، لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن بہت سی ہستیوں کا شکریہ بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اس نعمت بخشی میں دخیل اور حصہ دار (باقی صفحہ ۲۹۶ پر)

پُوجتے ہیں جن کے ہاتھ میں نہ آسمانوں سے انہیں رزق دینا ہے نہ زمین سے اور نہ یہ کام وہ کر ہی سکتے ہیں؟ پس اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو،[لے] اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۹۵) ٹھیرا رکھا تھا۔ اسی چیز کو قرآن "اللہ کے احسان کا انکار" قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدۂ کلیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکریہ غیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سفارش سے، یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے، یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔ یہ دونوں اصولی باتیں سراسر انصاف اور عقل عام کے مطابق ہیں۔ ہر شخص خود بادنیٰ تامل ان کی معقولیت سمجھ سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک حاجت مند آدمی پر رحم کھا کر اس کی مدد کرتے ہیں، اور وہ اسی وقت اٹھ کر آپ کے سامنے ایک دوسرے آدمی کا شکریہ ادا کر دیتا ہے جس کا اس امداد میں کوئی دخل نہ تھا۔ آپ چاہے اپنی فراخدلی کی بنا پر اس کی اس بیہودگی کو نظر انداز کر دیں اور آئندہ بھی اپنی امداد کا سلسلہ جاری رکھیں، مگر اپنے دل میں یہ ضرور سمجھیں گے کہ یہ ایک نہایت بدتمیز اور احسان فراموش آدمی ہے۔ پھر اگر دریافت کرنے پر آپ کو معلوم ہو کہ اس شخص نے یہ حرکت اس خیال کی بنا پر کی تھی کہ آپ نے اس کی جو کچھ بھی مدد کی ہے وہ اپنی نیک دلی اور فیاضی کی وجہ سے نہیں کی بلکہ اُس دوسرے شخص کی خاطر کی ہے، درانحالیکہ یہ واقعہ نہ تھا، تو آپ لامحالہ اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔ اُس کی اس بیہودہ تاویل کا صریح مطلب آپ کے نزدیک یہ ہوگا کہ وہ آپ سے سخت بدگمان ہے اور آپ کے متعلق یہ رائے رکھتا ہے کہ آپ کوئی رحیم اور شفیق انسان نہیں ہیں، بلکہ محض ایک دوست نواز اور یار باش آدمی ہیں، چند لگے بندھے دوستوں کے توسل سے کوئی آئے تو آپ اس کی مدد اُن دوستوں کی خاطر کر دیتے ہیں، ورنہ آپ کے ہاتھ سے کسی کو کچھ فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔

[لے] اللہ کے لیے مثالیں نہ گھڑو، یعنی اللہ کو دنیوی بادشاہوں اور راجوں اور مہاراجوں پر قیاس نہ کرو کہ جس طرح کوئی اُن کے مصاحبوں اور مقربِ بارگاہ ملازموں کے توسط کے بغیر اُن تک اپنی عرض معروض نہیں پہنچا سکتا اُسی طرح اللہ کے متعلق بھی تم یہ گمان کرنے لگو کہ وہ اپنے قصرِ شاہی میں ملائکہ اور اولیاء اور دوسرے مقربین کے درمیان گھرا بیٹھا ہے اور کسی کا کوئی کام اِن واسطوں کے بغیر اُس کے ہاں سے نہیں بن سکتا۔

اللہ ایک مثال دیتا ہےؔ۔ ایک تو ہے غلام، جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ایسا ہے جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا کیا ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور چھپے خوب خرچ کرتا ہے۔ بتاؤ، کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ — الحمد للہؔ، مگر اکثر لوگ (اس سیدھی بات کو) نہیں جانتےؔ۔

ؔ یعنی اگر مثالوں ہی سے بات سمجھنی ہے تو اللہ صحیح مثالوں سے تم کو حقیقت سمجھاتا ہے۔ تم جو مثالیں دے رہے ہو وہ غلط ہیں، اس لیے تم ان سے غلط نتیجے نکال بیٹھتے ہو۔

ؔ سوال اور الحمد للہ کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے بھرنے کے لیے خود لفظ الحمد للہ ہی میں ایک بلیغ اشارہ موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ نبیؐ کی زبان سے یہ سوال سُن کر مشرکین کے لیے اس کا یہ جواب دینا تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ دونوں برابر ہیں۔ لامحالہ اس کے جواب میں کسی نے صاف صاف اقرار کیا ہوگا کہ واقعی دونوں برابر نہیں ہیں، اور کسی نے اس اندیشے سے خاموشی اختیار کر لی ہوگی کہ اقراری جواب دینے کی صورت میں اس کے منطقی نتیجے کا بھی اقرار کرنا ہوگا اور اس سے خود بخود ان کے شرک کا ابطال ہو جائیگا۔ لہٰذا نبیؐ نے دونوں کا جواب پا کر فرمایا الحمد للہ۔ اقرار کرنے والوں کے اقرار پر بھی الحمد للہ، اور خاموش رہ جانے والوں کی خاموشی پر بھی الحمد للہ۔ پہلی صورت میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ "خدا کا شکر ہے، اتنی بات تو تمہاری سمجھ میں آئی"۔ دوسری صورت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ "خاموش ہو گئے؟ الحمد للہ، اپنی ساری ہٹ دھرمیوں کے باوجود دونوں کو برابر کہہ دینے کی ہمت تم بھی نہ کر سکے"۔

ؔ یعنی باوجودیکہ انسانوں کے درمیان وہ صریح طور پر با اختیار اور بے اختیار کے فرق کو محسوس کرتے ہیں، اور اس فرق کو ملحوظ رکھ کر ہی دونوں کے ساتھ الگ الگ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، پھر بھی وہ ایسے جاہل و نادان بنے ہوئے ہیں کہ خالق اور مخلوق کا فرق ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ خالق کی ذات اور صفات اور حقوق اور اختیارات سب میں وہ مخلوق کو اس کا شریک سمجھ رہے ہیں اور مخلوق کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں جو صرف خالق کے ساتھ ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ عالم اسباب میں کوئی چیز مانگنی ہو تو گھر کے مالک سے مانگیں گے نہ کہ گھر کے غلام سے۔ مگر مبدأ فیض سے حاجات طلب کرتی ہوں تو کائنات کے مالک کو چھوڑ کر اس کے بندوں کے آگے ہاتھ پھیلا دیں گے۔

اللہ ایک اور مثال دیتا ہے۔ دو آدمی ہیں۔ ایک گونگا بہرا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا، اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے، جدھر بھی وہ اسے بھیجے کوئی بھلا کام اس سے بن نہ آئے۔ دوسرا شخص ایسا ہے کہ انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود راہِ راست پر قائم ہے۔ بتاؤ کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟۱؎ ع ج

زمین اور آسمانوں کی تمام پوشیدہ حقیقتوں کا علم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۲؎۔ اور قیامت کا معاملہ بس پلک جھپکانے میں واقع ہو جائے گا، بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہی میں۳؎۔ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

۱؎ پہلی مثال میں اللہ اور بناوٹی معبودوں کے فرق کو صرف اختیار اور بے اختیاری کے اعتبار سے نمایاں کیا گیا تھا۔ اب اس دوسری مثال میں وہی فرق اور زیادہ طول کر صفات کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور ان بناوٹی معبودوں کے درمیان فرق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک با اختیار مالک ہے اور دوسرا بے اختیار غلام۔ بلکہ مزید برآں یہ فرق بھی ہے کہ یہ غلام نہ تمہاری پکار سنتا ہے، نہ اس کا جواب دے سکتا ہے، نہ کوئی کام باختیارِ خود کر سکتا ہے۔ اس کی اپنی زندگی کا سارا انحصار اس کے آقا کی ذات پر ہے۔ اور آقا اگر کوئی کام اس پر چھوڑ دے تو وہ کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ بخلاف اس کے آقا کا حال یہ ہے کہ صرف ناطق ہی نہیں ناطقِ حکیم ہے، دنیا کو عدل کا حکم دیتا ہے۔ اور صرف فاعلِ مختار ہی نہیں، فاعلِ برحق ہے، جو کچھ کرتا ہے راستی اور صحت کے ساتھ کرتا ہے۔ بتاؤ یہ کونسی دانائی ہے کہ تم ایسے آقا اور ایسے غلام کو یکساں سمجھ رہے ہو؟

۲؎ بعد کے فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل جواب ہے کفارِ مکہ کے اس سوال کا جو وہ اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے کہ اگر واقعی وہ قیامت آنے والی ہے جس کی تم ہمیں خبر دیتے ہو تو آخر وہ کس تاریخ کو آئیگی۔ یہاں ان کے سوال کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

۳؎ یعنی قیامت رفتہ رفتہ کسی طویل مدت میں واقع نہ ہوگی، نہ اس کی آمد سے پہلے تم دور سے اس کو آتے دیکھو گے کہ سنبھل سکو اور کچھ اس کے لیے تیاری کر سکو۔ وہ تو کسی روز اچانک پلک جھپکتے میں، بلکہ اس سے بھی کم مدت میں آجائے گی۔ لہٰذا جس کو غور کرنا ہو سنجیدگی کے ساتھ غور کرے، اور اپنے رویّے کے متعلق جو فیصلہ بھی کرنا ہو جلدی کر لے، کسی کو اس بھروسے پر نہ رہنا چاہیے کہ ابھی تو قیامت دور ہے۔ (باقی صفحہ ۲۹۹ پر)

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اُس نے تمہیں کان دیے، آنکھیں دیں، اور سوچنے والے دل دیے[۷۲]، اس لیے کہ تم شکر گزار بنو[۷۳]۔
کیا اِن لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخّر ہیں؟ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے؟ اس میں بہت نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔
اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو جائے سکون بنایا۔ اس نے جانوروں کی کھالوں سے تمہارے لیے ایسے مکان پیدا کیے[۷۴] جنہیں تم سفر اور قیام، دونوں حالتوں میں ہلکا پاتے ہو[۷۵]۔ اس

(بقیہ حاشیہ ۲۹۸) دُور ہے جب آنے لگیگی تو اللہ سے معاملہ درست کر لیں گے ـــ توحید کی تقریر کے درمیان یکایک قیامت کا یہ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ لوگ توحید اور شرک کے درمیان کسی ایک عقیدے کے انتخاب کے سوال کو محض ایک نظری سوال نہ سمجھ بیٹھیں، بلکہ انہیں یہ احساس رہے کہ ایک فیصلہ کی گھڑی کسی نامعلوم وقت پر اچانک آجانے والی ہے اور اس وقت اسی انتخاب کے صحیح یا غلط ہونے پر آدمی کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہوگا۔ اس تنبیہ کے بعد پھر وہی سلسلۂ تقریر شروع ہو جاتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا تھا۔

[۷۲] یعنی وہ ذرائع جن سے تمہیں دنیا میں ہر طرح کی واقفیت حاصل ہوئی اور تم اس لائق ہوئے کہ دنیا کے کام چلا سکو۔ انسان کا بچہ پیدائش کے وقت جتنا بے بس اور بے خبر ہوتا ہے اتنا کسی جانور کا بچہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ صرف اللہ کے دیے ہوئے ذرائع علم (سماعت، بینائی، اور تعقل و تفکر) ہی ہیں جن کی بدولت وہ ترقی کر کے تمام موجوداتِ ارضی پر حکمرانی کرنے کے لائق بن جاتا ہے۔

[۷۳] یعنی اُس خدا کے شکر گزار جس نے یہ بیش بہا نعمتیں تم کو عطا کیں۔ اِن نعمتوں کی اس سے بڑھ کر ناشکری اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کانوں سے آدمی سب کچھ سنے مگر ایک خدا ہی کی بات نہ سنے، ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھے مگر ایک خدا ہی کی آیات نہ دیکھے، اور اس دماغ سے سب کچھ سوچے مگر ایک یہی بات نہ سوچے کہ میرا وہ محسن کون ہے جس نے یہ انعامات مجھے دیے ہیں۔

[۷۴] یعنی چمڑے کے خیمے جن کا رواج عرب میں بہت ہے۔

[۷۵] یعنی جب کوچ کرنا چاہتے ہو تو انہیں آسانی سے تہ کر کے اٹھائے جاتے ہو اور جب قیام کرنا چاہتے ہو تو آسانی

نے جانوروں کے صوف اور اُون اور بالوں سے تمہارے لیے پہننے اور برتنے کی بہت سی چیزیں پیدا کر دیں جو زندگی کی مدتِ مقررہ تک تمہارے کام آتی ہیں۔ اس نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی چیزوں سے تمہارے لیے سائے کا انتظام کیا، پہاڑوں میں تمہارے لیے پناہ گاہیں بنائیں، اور تمہیں ایسی پوشاکیں بخشیں جو تمہیں گرمی سے بچاتی ہیں[1] اور کچھ دوسری پوشاکیں جو آپس کی جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں[2]۔ اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے[3] شاید کہ تم فرمانبردار بنو۔ اب اگر یہ لوگ

---

[1] سردی سے بچانے کا ذکر یا تو اس لیے نہیں فرمایا کہ گرمی میں کپڑوں کا استعمال انسانی تمدن کا تکمیلی درجہ ہے اور درجۂ کمال کا ذکر کر دینے کے بعد ابتدائی درجات کے ذکر کی حاجت نہیں رہتی، یا پھر اسے خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ جن ملکوں میں نہایت مہلک قسم کی بادِ سموم چلتی ہے وہاں سردی کے لباس سے بھی بڑھ کر گرمی کا لباس اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے ممالک میں اگر آدمی سر، گردن، کان اور سارا جسم اچھی طرح ڈھانک کر نہ نکلے تو گرم ہوا اسے جھلس کر رکھ دے۔ بلکہ بعض اوقات تو آنکھوں کو چھوڑ کر پورا منہ تک لپیٹ لینا پڑتا ہے۔

[2] یعنی زرہ بکتر۔

[3] اتمامِ نعمت یا تکمیلِ نعمت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے ہر پہلو میں انسان کی ضروریات کا پوری جزرسی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور پھر ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام فرماتا ہے۔ مثلاً اسی معاملے کو لیجیے کہ خارجی اثرات سے انسان کے جسم کی حفاظت مطلوب تھی۔ اس کے لیے اللہ نے کس کس پہلو سے کتنا کتنا اور کیسا کچھ سروسامان کیا، اس کی تفصیلات اگر کوئی لکھنے بیٹھے تو ایک پوری کتاب تیار ہو جائے۔ یہ گویا لباس اور مکان کے پہلو میں اللہ کی نعمت کا اتمام ہے۔ یا مثلاً تغذیہ کے معاملہ کو لیجیے۔ اس کے لیے کتنے بڑے پیمانے پر، کیسے کیسے تنوعات کے ساتھ کیسی کیسی جزئی ضرورتوں تک کا لحاظ کر کے اللہ تعالیٰ نے بے حد و حساب ذرائع فراہم کیے، آج اگر کوئی جائزہ لینے بیٹھے تو شاید محض اقسامِ غذا اور اشیاءِ غذا کی فہرست ہی ایک ضخیم جلد بن جائے۔ یہ گویا تغذیہ کے پہلو میں اللہ کی نعمت کا اتمام ہے۔ اسی طرح سے اگر انسانی زندگی کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہر گوشے میں اللہ نے ہم پر اپنی نعمتوں کا اتمام کر رکھا ہے۔

مُنہ موڑتے ہیں تو اے محمدؐ، تم پر صاف صاف پیغام حق پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ اللہ کے احسان کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں[1]۔ اور ان میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں ؏

(انہیں کچھ ہوش بھی ہے کہ اُس روز کیا بنیگی) جبکہ ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے[2]، پھر کافروں کو نہ حجتیں پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا[3]، نہ ان سے توبہ و استغفار ہی کا مطالبہ کیا جائیگا[4]

[1] انکار سے مراد وہی طرزِ عمل ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کفار مکہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ یہ سارے احسانات اللہ نے اُن پر کیے ہیں، مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ نے یہ احسانات اُن کے بزرگوں اور دیوتاؤں کی مداخلت سے کیے ہیں، اور اسی بنا پر وہ ان احسانات کا شکریہ اللہ کے ساتھ، بلکہ کچھ اللہ سے بھی بڑھ کر ان متوسط ہستیوں کو ادا کرتے تھے۔ اسی حرکت کو اللہ تعالیٰ انکارِ نعمت اور احسان فراموشی اور کفران سے تعبیر کرتا ہے۔

[2] یعنی اُس اُمت کا نبی، یا کوئی ایسا شخص جس نے نبی کے گذر جانے کے بعد اس امت کو توحید اور خالص خدا پرستی کی دعوت دی ہو، شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم پر متنبہ کیا ہو، اور روز قیامت کی جوابدہی سے خبردار کر دیا ہو۔ وہ اس امر کی شہادت دیگا کہ میں نے پیغام حق اِن لوگوں کو پہنچا دیا تھا، اس لیے جو کچھ انہوں نے کیا وہ ناواقفیت کی بنا پر نہیں کیا بلکہ جانتے بوجھتے کیا۔

[3] یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں صفائی پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائیگی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے جرائم ایسی صریح ناقابلِ انکار اور ناقابلِ تاویل شہادتوں سے ثابت کر دیئے جائیں گے کہ ان کے لیے صفائی پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہیگی۔

[4] یعنی اُس وقت اُن سے یہ نہیں کہا جائیگا کہ اب اپنے رب سے اپنے قصوروں کی معافی مانگ لو۔ کیونکہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا، معافی طلب کرنے کا وقت گزر چکا ہوگا۔ قرآن اور حدیث دونوں اس معاملہ میں ناطق ہیں کہ توبہ و استغفار کی جگہ دنیا ہے نہ کہ آخرت۔ اور دنیا میں بھی اس کا موقع صرف اسی وقت تک ہے جب تک آثارِ موت طاری نہیں ہو جاتے۔ جس وقت آدمی کو یقین ہو جائے کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے اُس وقت کی توبہ ناقابلِ قبول ہے۔ موت کی سرحد میں داخل ہوتے ہی آدمی کی مہلتِ عمل ختم ہو جاتی ہے اور صرف جزا و سزا ہی کا استحقاق باقی رہ جاتا ہے۔

ظالم لوگ جب ایک دفعہ عذاب دیکھ لیں گے تو اس کے بعد نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ انہیں ایک لمحہ بھر کی مہلت دی جائے گی۔ اور جب وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں شرک کیا تھا اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے "اے پروردگار! یہی ہیں ہمارے وہ شریک جنہیں ہم تجھے چھوڑ کر پکارا کرتے تھے"۔ اس پر ان کے وہ معبود انہیں صاف جواب دیں گے کہ "تم جھوٹے ہو"[۱]۔ اس وقت یہ سب اللہ کے آگے جھک جائیں گے اور ان کی وہ ساری افترا پردازیاں رفوچکر ہو جائیں گی جو یہ دنیا میں کرتے رہے تھے[۲]۔ جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انہیں ہم عذاب پر عذاب دیں گے[۳] اُس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں برپا کرتے رہے۔

(اے محمدؐ! انہیں اُس دن سے خبردار کر دو) جب کہ ہم ہر اُمت میں خود اُسی کے اندر سے ایک گواہ اُٹھا کھڑا کریں گے جو اُس کے مقابلہ میں شہادت دیگا، اور اِن لوگوں کے مقابلے میں

---

[۱] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بجائے خود اس واقعہ کا انکار کریں گے کہ مشرکین انہیں حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے پکارا کرتے تھے، بلکہ دراصل وہ اس واقعہ کے متعلق اپنے علم و اطلاع اور اس پر اپنی رضامندی و ذمہ داری کا انکار کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہمیں پکارا کرو، نہ ہم تمہاری اس حرکت پر راضی تھے، بلکہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہمیں پکار رہے ہو۔ تم نے اگر ہمیں سمیع الدعاء، اور مجیب الدعوات، اور دستگیر و فریاد رس قرار دیا تھا تو یہ قطعی ایک جھوٹی بات تھی جو تم نے گھڑ لی تھی اور اس کے ذمہ دار تم خود تھے۔ اب ہمیں اس کی ذمہ داری میں لپیٹنے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔

[۲] یعنی وہ سب غلط ثابت ہو گی جن جن سہاروں پر وہ دنیا میں بھروسا کیے ہوئے تھے وہ سارے کے سارے گم ہو جائیں گے۔ کسی فریاد رس کو وہاں فریاد رسی کے لیے موجود نہ پائیں گے۔ کوئی مشکل کشا ان کی مشکل حل کرنے کے لیے نہیں ملیگا۔ کوئی آگے بڑھ کر یہ کہنے والا نہ ہوگا کہ یہ میرے متوسل تھے، انہیں کچھ نہ کہا جائے۔

[۳] یعنی ایک عذاب خود کفر کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو راہِ خدا سے روکنے کا۔

شہادت دینے کے لیے ہم تمہیں لائیں گے۔ اور (یہ اسی شہادت کی تیاری ہے کہ) ہم نے یہ کتاب تم پر
نازل کر دی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے[۱] اور ہدایت و رحمت اور بشارت
ہے اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے[۲]۔ ع ۱۲
اللہ انصاف اور احسان[۳] اور صلۂ رحمی[۴] کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے

۱۔ یعنی ہر ایسی چیز کی وضاحت جس پر ہدایت و ضلالت اور فلاح و خسران کا مدار ہے، جس کا جاننا راست روی کے لیے ضروری ہے، جس سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔

۲۔ یعنی جو لوگ آج اس کتاب کو مان لیں گے اور اطاعت کی راہ اختیار کر لیں گے ان کو یہ زندگی کے ہر معاملہ میں صحیح رہنمائی دیگی اور اس کی پیروی کی وجہ سے اُن پر اللہ کی رحمتیں ہونگی اور انہیں یہ کتاب اطمینان دلائے گی کہ فیصلے کے دن اللہ کی عدالت سے وہ کامیاب ہو کر نکلیں گے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اسے نہ مانیں گے وہ صرف یہی نہیں کہ ہدایت اور رحمت سے محروم رہیں گے، بلکہ قیامت کے روز جب خدا کا پیغمبر ان کے مقابلہ میں گواہی دینے کھڑا ہو گا تو یہی دستاویز اُن کے خلاف ایک زبردست حجت ہو گی۔ کیونکہ پیغمبر یہ ثابت کر دیگا کہ اس نے وہ چیز انہیں پہنچا دی تھی جس میں حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دیا گیا تھا۔

۳۔ یعنی نیک برتاؤ اور نیک سلوک، ہر اُس شخص کے ساتھ جس سے آدمی کو سابقہ پیش آئے۔

۴۔ صلۂ رحمی کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعت الٰہی ہر خاندان کے خوشحال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اِس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو (باقی ص ۳۰ پر)

منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو، اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اُس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سُوت کاتا اور پھر آپ ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو آپس کے

(بقیہ حاشیہ ص۳۰۳) معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں، اور ہر خاندان کے خوشحال افراد پر پہلا حق ان کے اپنے غریب رشتہ داروں کا ہے، پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حقدار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے، اور اس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں، اور پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں۔ اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں، اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔

؎ یہاں علی الترتیب تین قسم کے معاہدوں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے الگ الگ بیان کر کے ان کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک وہ عہد جو انسان نے خدا کے ساتھ باندھا ہو، اور یہ اپنی اہمیت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ دوسرا وہ عہد جو ایک انسان یا گروہ نے دوسرے انسان یا گروہ سے باندھا ہو اور اس پر اللہ کی قسم کھائی ہو، یا کسی نہ کسی طور پر اللہ کا نام لیکر اپنے قول کی پختگی کا یقین دلایا ہو۔ یہ دوسرے درجے کی اہمیت رکھتا ہے۔ تیسرا وہ عہد و پیمان جو اللہ کا نام لیے بغیر کیا گیا ہو۔ اس کی اہمیت اوپر کی دونوں قسموں کے بعد ہے۔ لیکن پابندی ان سب کی ضروری ہے اور خلاف ورزی ان میں سے کسی کی بھی روا نہیں ہے۔

معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے حاصل کرے حالانکہ اللہ اس عہد و پیمان کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے[1]، اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے تمام اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دیگا[2] - اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی کہ تم میں

---

[1] یہاں خصوصیت کے ساتھ عہد شکنی کی اس بدترین قسم پر ملامت کی گئی ہے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر موجب فساد ہوتی ہے اور جسے بڑے بڑے اونچے درجے کے لوگ بھی کارِ ثواب سمجھ کر کرتے اور اپنی قوم سے داد پاتے ہیں۔ قوموں اور گروہوں کی سیاسی، معاشی اور مذہبی کشمکش میں یہ آئے دن ہوتا رہتا ہے کہ ایک قوم کا لیڈر ایک وقت میں دوسری قوم سے ایک معاہدہ کرتا ہے اور دوسرے وقت میں محض اپنے قومی مفاد کی خاطر یا تو اسے علانیہ توڑ دیتا ہے یا درپردہ اس کی خلاف ورزی کر کے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔ یہ حرکتیں ایسے ایسے لوگ تک کر گزرتے ہیں جو اپنی ذاتی زندگی میں بڑے راستباز ہوتے ہیں۔ اور ان حرکتوں پر صرف یہی نہیں کہ ان کی پوری قوم میں سے ملامت کی کوئی آواز نہیں اُٹھتی، بلکہ ہر طرف سے ان کی پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس طرح کی چالبازیوں کو ڈپلومیسی کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر متنبہ فرماتا ہے کہ ہر معاہدہ دراصل معاہدہ کرنے والے شخص اور قوم کے اخلاق و دیانت کی آزمائش ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں ناکام ہونگے وہ اللہ کی عدالت میں مواخذہ سے نہ بچ سکیں گے۔

[2] یعنی یہ فیصلہ تو قیامت ہی کے روز ہوگا کہ جن اختلافات کی بنا پر تمہارے درمیان کشمکش برپا ہے ان میں برسرِ حق کون ہے اور برسرِ باطل کون۔ لیکن بہرحال، خواہ کوئی سراسر حق پر ہی کیوں نہ ہو اور اس کا حریف بالکل گمراہ اور باطل پرست ہی کیوں نہ ہو، اُس کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے گمراہ حریف کے مقابلہ میں عہد شکنی اور کذب و افترا اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرے۔ اگر وہ ایسا کریگا تو قیامت کے روز اللہ کے امتحان میں ناکام ثابت ہوگا، کیونکہ حق پرستی صرف نظریے اور مقصد ہی میں صداقت کا مطالبہ نہیں کرتی، طریقِ کار اور ذرائع میں بھی صداقت ہی چاہتی ہے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ اُن مذہبی گروہوں کی تنبیہ کے لیے فرمائی جا رہی ہے جو ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ ہم چونکہ خدا کے طرفدار ہیں اور ہمارا فریقِ مقابل خدا کا (باقی صفحہ ۳۰۶ پر)

کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی اُمّت بنا دیتا[1]، مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے[2]، اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی۔

(اور اے مسلمانو) تم اپنی قسموں کو آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ذریعہ نہ بنالینا'

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۵) باغی ہے اس لیے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اسے جس طریقہ سے بھی ممکن ہو زک پہنچائیں، ہم پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی صداقت، امانت اور وفائے عہد کا لحاظ رکھیں۔ ٹھیک یہی بات تھی جو عرب کے یہودی کہا کرتے تھے کہ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ یعنی مشرکین عرب کے معاملہ میں ہم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ان سے ہر طرح کی خیانت کی جا سکتی ہے، جس چال اور تدبیر سے بھی خدا کے پیاروں کا بھلا ہو اور کافروں کو زک پہنچے وہ بالکل روا ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

[1] یہ پچھلے مضمون کی مزید توضیح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کا طرفدار سمجھ کر بھلے اور برے ہر طریقے سے اپنے مذہب کو (جسے وہ خدائی مذہب سمجھ رہا ہے) فروغ دینے اور دوسرے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کی یہ حرکت سراسر اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر اللہ کا منشا واقعی یہ ہوتا کہ انسان سے مذہبی اختلاف کا اختیار چھین لیا جائے اور چار و ناچار سارے انسانوں کو ایک ہی مذہب کا پیرو بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لیے اللہ کو اپنے ان نام نہاد "طرف داروں" کی اور ان کے ذلیل ہتھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا۔ وہ سب کو مومن و فرمانبردار پیدا کر دیتا اور کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا۔ پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان وطاعت کی راہ سے بال برابر بھی جنبش کر سکتا۔

[2] یعنی انسان کو اختیار و انتخاب کی آزادی اللہ نے خود ہی دی ہے، اس لیے انسانوں کی راہیں دنیا میں مختلف ہیں۔ کوئی گمراہی کی طرف جانا چاہتا ہے اور اللہ اس کے لیے گمراہی کے اسباب ہموار کر دیتا ہے، اور کوئی راہِ راست کا طالب ہوتا ہے اور اللہ اس کی ہدایت کا انتظام فرما دیتا ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قدم جمنے کے بعد اکھڑ جائے[1] اور تم اس جرم کی پاداش میں کہ تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، برا نتیجہ دیکھو اور سخت سزا بھگتو۔ اللہ کے عہد[2] کو تھوڑے سے فائدے کے بدلے نہ بیچ ڈالو،[3] جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے، اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں[4] کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔ جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے[5] اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے

---

۱ یعنی کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہو جانے کے بعد محض تمہاری بداخلاقی دیکھ کر اس دین سے برگشتہ ہو جائے اور صرف اس وجہ سے وہ اہلِ ایمان کے گروہ میں شامل ہونے سے رُک جائے کہ اس گروہ کے جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آیا ہو ان کو اخلاق اور معاملات میں اس نے کفار سے کچھ بھی مختلف نہ پایا ہو۔

۲ یعنی اُس عہد کو جو تم نے اللہ کے نام پر کیا ہو، یا دینِ الٰہی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے کیا ہو۔

۳ یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے بڑے فائدے کے بدلے بیچ سکتے ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا جو فائدہ بھی ہے وہ اللہ کے عہد کی قیمت میں تھوڑا ہے۔ اس لیے اس بیش بہا چیز کو اُس کے عوض بیچنا بہر حال خسارے کا سودا ہے۔

۴ "صبر سے کام لینے والوں کو" یعنی اُن لوگوں کو جو ہر طمع اور خواہش اور جذبۂ نفسانی کے مقابلہ میں حق اور راستی پر قائم رہیں، ہر اُس نقصان کو برداشت کر لیں جو اس دنیا میں راستبازی اختیار کرنے سے پہنچتا ہو، ہر اُس فائدے کو ٹھکرا دیں جو دنیا میں ناجائز طریقے اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتا ہو، اور حسنِ عمل کے مفید نتائج کے لیے اُس وقت تک انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں جو موجودہ دنیوی زندگی ختم ہو جانے کے بعد دوسری دنیا میں آنے والا ہے۔

۵ اِس آیت میں مسلم اور کافر دونوں ہی گروہوں کے اُن تمام کم نظر اور بے صبر لوگوں کی غلط فہمی دُور کی گئی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی اور دیانت اور پرہیزگاری کی روش اختیار (باقی ص ۳۰۸ پر)

مطابق بخشیں گے۔لہ

پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطانِ رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔ٹلہ اُسے اُن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۷) کرنے سے آدمی کی آخرت چاہے بن جاتی ہو مگر اس کی دنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ اس صحیح رویہ سے محض آخرت ہی نہیں بنتی، دنیا بھی بنتی ہے جو لوگ حقیقت میں ایماندار اور پاکباز اور معاملہ کے کھرے ہوتے ہیں اُن کی دنیوی زندگی بھی بے ایمان اور بدعمل لوگوں کے مقابلہ میں صریحاً بہتر رہتی ہے۔ جو ساکھ اور سچی عزت اپنی بے داغ سیرت کی وجہ سے انہیں نصیب ہوتی ہے وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ جو ستھری اور پاکیزہ کامیابیاں انہیں حاصل ہوتی ہیں وہ ان لوگوں کو میسر نہیں آتیں جن کی ہر کامیابی گندے اور گھناؤنے طریقوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ بوریا نشین ہو کر بھی قلب کے جس اطمینان اور ضمیر کی جس ٹھنڈک سے بہرہ مند ہوتے ہیں اس کا کوئی ادنیٰ سا حصہ بھی محلوں میں رہنے والے فساق و فجار نہیں پا سکتے۔

لہ یعنی آخرت میں ان کا مرتبہ اُن کے بہتر سے بہتر اعمال کے لحاظ سے مقرر ہوگا۔ بالفاظ دیگر جس شخص نے دنیا میں چھوٹی اور بڑی، ہر طرح کی نیکیاں کی ہونگی اُسے وہ اونچا مرتبہ دیا جائیگا جس کا وہ اپنی بڑی سے بڑی نیکی کے لحاظ سے مستحق ہوگا۔

ٹلہ اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بس زبان سے أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہہ دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ فی الواقع دل میں یہ خواہش اور عملاً یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ آدمی قرآن پڑھتے وقت شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے محفوظ رہے، غلط اور بے جا شکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہو، قرآن کی ہر بات کو اس کی صحیح روشنی میں دیکھے، اور اپنے خود ساختہ نظریات یا باہر سے حاصل کیے ہوئے تخیلات کی آمیزش سے قرآن کے الفاظ کو وہ معنی نہ پہنانے لگے جو اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہوں۔ اس کے ساتھ آدمی کے دل میں یہ احساس بھی موجود ہونا چاہیے کہ شیطان سب سے بڑھ کر جس چیز کے درپے ہے وہ یہی ہے کہ ابن آدم قرآن سے ہدایت نہ حاصل کرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان اُسے بہکانے اور اخذِ ہدایت سے روکنے اور فکر و فہم کی غلط راہوں پر ڈالنے کے لیے (باقی صفحہ ۳۰۹ پر)

لوگوں پر تسلّط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔ اس کا زور تو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں ؏ ۱۳

جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں ـــــ اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرے ـــ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو[۱]۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے

(بقیہ حاشیہ ص۳۰۸) ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ اس لیے آدمی کو اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت انتہائی چوکنا رہنا چاہیے اور ہر وقت خدا سے مدد مانگتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان کی دراندازیاں اُسے اس سرچشمۂ ہدایت کے فیض سے محروم نہ کر دیں۔ کیونکہ جس نے یہاں سے ہدایت نہ پائی وہ پھر کہیں ہدایت نہ پا سکے گا، اور جو اس کتاب سے گمراہی اخذ کر بیٹھا اسے پھر دنیا کی کوئی چیز گمراہیوں کے چکر سے نہ نکال سکے گی۔

اس سلسلۂ کلام میں یہ آیت جس غرض کے لیے آئی ہے وہ یہ ہے کہ آگے چل کر اُن اعتراضات کا جواب دیا جا رہا ہے جو مشرکینِ مکہ قرآن مجید پر کیا کرتے تھے، اس لیے پہلے تمہید کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ قرآن کو اُس کی اصلی روشنی میں صرف وہی شخص دیکھ سکتا ہے جو شیطان کی گمراہ کُن وسوسہ اندازیوں سے چوکنا ہو اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ سے پناہ مانگے۔ ورنہ شیطان کبھی آدمی کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ سیدھی طرح قرآن کو اور اس کی باتوں کو سمجھ سکے۔

[۱] ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے سے مراد ایک حکم کے بعد دوسرا حکم بھیجنا بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ قرآن مجید کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں اور بارہا ایک ہی معاملہ میں چند سال کے وقفوں سے یکے بعد دیگرے دو دو، تین تین حکم بھیجے گئے ہیں، مثلاً شراب کا معاملہ، یا زنا کی سزا کا معاملہ۔ لیکن ہم کو یہ معنی لینے میں اس بنا پر تامل ہے کہ سورۂ نحل کی یہ آیت مکّی دور میں نازل ہوئی ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس دور میں تدریج فی الاحکام کی کوئی مثال پیش نہیں آئی تھی۔ اس لیے ہم یہاں "ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لیے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصہ بار بار آیا ہے اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملہ کا (باقی ص۳۱۱ پر)

اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ اِن سے کہو کہ اسے تو روح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے[1] تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کرے[2] اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۹) کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک بات ایک وقت میں مجمل طور پر کہی گئی ہے اور دوسرے وقت میں مفصل۔ یہی چیز تھی جسے کفارِ مکہ اس بات کی دلیل ٹھیراتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ یہ قرآن خود تصنیف کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر اس کلام کا منبع علمِ الٰہی ہوتا تو پوری بات یک وقت کہہ دی جاتی، اللہ کوئی انسان کی طرح ناقص العلم تھوڑا ہی ہے کہ سوچ سوچ کر بات کرے، رفتہ رفتہ معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک بات ٹھیک بیٹھتی نظر نہ آئے تو دوسرے طریقہ سے بات کرے۔ یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں جو تمہارے اس کلام میں نظر آرہی ہیں۔

[1] "روح القدس" کا لفظی ترجمہ ہے "پاک روح" یا "پاکیزگی کی روح"۔ اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریلؑ کو دیا گیا ہے۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے مقصود سامعین کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کلام کو ایک ایسی روح لے کر آرہی ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائن ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے کچھ اور بنا دے، نہ کذّاب و مُفتری ہے کہ خود کوئی بات گھڑ کے اللہ کے نام سے بیان کر دے، اور نہ بدنیت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس و مطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لا کر پہنچاتی ہے۔

[2] یعنی اس کے بتدریج اس کلام کو لیکر آنے اور بیک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علم و دانش میں کوئی نقص ہے، جیسا کہ تم نے اپنی نادانی سے سمجھا، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوتِ فہم اور قوتِ اخذ میں نقص ہے جس کے سبب سے وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک وقت کی سمجھی ہوئی بات میں پختہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ روح القدس اس کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے لائے، کبھی اجمال سے کام لے اور کبھی اسی بات کی (باقی صفحہ ۳۱۱ پر)

فرمانبرداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتلائے اور انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے۔[۲۲]

ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے متعلق کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے۔[۲۳]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۰) تفصیل بتلائے، کبھی ایک طریقہ سے بات سمجھائے اور کبھی اسے سمجھانے کے لیے دوسرا طریقہ استعمال کرے، کبھی ایک پیرایۂ بیان اختیار کرے اور کبھی وہی بات دوسرے پیرایہ میں بیان کرے، اور ایک ہی بات کو بار بار طریقہ طریقہ سے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے، تاکہ مختلف قابلیتوں اور استعدادوں کے طالبینِ حق ایمان لاسکیں اور ایمان لانے کے بعد علم و یقین اور فہم و ادراک میں پختہ ہو سکیں۔

۲۱ یہ اس تدریج کی دوسری مصلحت ہے یعنی یہ کہ جو لوگ ایمان لاکر فرمانبرداری کی راہ چل رہے ہیں ان کو دعوتِ اسلامی کے کام میں اور زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں جس موقع پر جس قسم کی ہدایات درکار ہوتی ہیں وہ بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نہ انہیں قبل از وقت بھیجنا مناسب ہو سکتا ہے، اور نہ یک وقت ساری ہدایات دے دینا مفید ہے۔

۲۲ یہ اُس کی تیسری مصلحت ہے یعنی یہ کہ فرماں برداروں کو جن مزاحمتوں اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے، اور جس جس طرح انہیں ستایا اور تنگ کیا جا رہا ہے، اور دعوتِ اسلامی کے کام میں مشکلات کے جو پہاڑ سدِّ راہ ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے وہ بار بار اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی جاتی رہے اور ان کو آخری نتائج کی کامیابی کا یقین دلایا جاتا رہے تاکہ وہ پُر امید رہیں اور دل شکستہ نہ ہونے پائیں۔

۲۳ روایات میں مختلف اشخاص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کفارِ مکہ اُن میں سے کسی پر یہ گمان کرتے تھے۔ ایک روایت میں اس کا نام جبر بیان کیا گیا ہے جو عامر بن الحضرمی کا ایک رومی غلام تھا۔ دوسری روایت میں حُویطب بن عبدالعزیٰ کے ایک غلام کا نام لیا گیا ہے جسے عائش یا یعیش کہتے تھے۔ ایک اور روایت میں یسار کا نام لیا گیا ہے جس کی کنیت ابو فکیہہ تھی اور جو مکہ کی ایک عورت کا یہودی غلام تھا۔ ایک اور روایت بلعان یا بلعام نامی ایک رومی غلام سے متعلق ہے۔ بہرحال ان میں سے جو بھی ہو، کفارِ مکہ نے محض یہ دیکھ کر کہ ایک شخص توراۃ و انجیل پڑھتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی (باقی صفحہ ۳۱۲ پر)

حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کو نہیں مانتے اللہ کبھی ان کو صحیح بات تک پہنچنے کی توفیق نہیں دیتا اور ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (جھوٹی باتیں نبی نہیں گھڑتا بلکہ جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں ماننتے، وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔ ^{له}

جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر) مگر جس نے دل کی رضامندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے^{ٹه}۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۱) اس سے ملاقات ہے، بے تکلف یہ الزام گھڑ دیا کہ اس قرآن کو در اصل وہ تصنیف کر رہا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے اپنی طرف سے خدا کا نام لے لے کر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت کے مخالفین آپ کے خلاف افترا پردازیاں کرنے میں کس قدر بے باک تھے، بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کی قدر و قیمت پہچاننے میں کتنے بے انصاف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے تاریخ انسانی کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھی جس کی نظیر نہ اس وقت دنیا بھر میں کہیں موجود تھی اور نہ آج تک پائی گئی ہے۔ مگر ان عقل کے اندھوں کو اس کے مقابلہ میں ایک عجمی غلام، جو کچھ توراۃ و انجیل پڑھ لیتا تھا، قابل تر نظر آ رہا تھا اور وہ گمان کر رہے تھے کہ یہ گوہر نایاب اس کوئلے سے چمک حاصل کر رہا ہے۔

له دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "جھوٹ تو وہ لوگ گھڑا کرتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے"۔

ٹه اس آیت میں اُن مسلمانوں کے معاملہ سے بحث کی گئی ہے جن پر اُس وقت سخت مظالم توڑے جا رہے تھے اور ناقابلِ برداشت اذیتیں دے دے کر کفر پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اُن کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم کسی وقت ظلم سے مجبور ہو کر محض جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر زبان سے ادا کر دو، اور دل تمہارا عقیدۂ کفر سے محفوظ ہو، تو معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر دل سے تم نے کفر قبول کر لیا تو دنیا میں چاہے (باقی صفحہ ۳۱۳ پر)

کو پسند کر لیا، اور اللہ کا قاعدہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو راہِ نجات نہیں دکھاتا جو اس کی نعمت کا کفران کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ یہ غفلت میں ڈوب چکے ہیں۔ ضرور ہے کہ آخرت میں یہی خسارے میں رہیں[۱۱۲]۔ بخلاف اس کے جن لوگوں کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۲) جان بچالو۔ خدا کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ دینا چاہیے۔ بلکہ یہ صرف رخصت ہے۔ اگر ایمان دل میں رکھتے ہوئے آدمی مجبوراً ایسا کہہ دے تو مواخذہ نہ ہوگا۔ ورنہ مقامِ عزیمت یہی ہے کہ خواہ آدمی کا جسم تکا بوٹی کر ڈالا جائے، بہر حال وہ کلمۂ حق ہی کا اعلان کرتا رہے۔ دونوں قسم کی نظیریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف خبابؓ بن ارت ہیں جن کو آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا یہاں تک کہ ان کی چربی پگھلنے سے آگ بجھ گئی مگر وہ سختی کے ساتھ اپنے ایمان پر جمے رہے۔ بلالؓ حبشی ہیں جن کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلجلاتی دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا، پھر تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر گھسیٹا گیا مگر وہ احد احد ہی کہتے رہے۔ حبیب بن زیدؓ بن عاصم ہیں جن کے بدن کا ایک ایک عضو مسیلمۂ کذاب کے حکم سے کاٹا جاتا تھا اور پھر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ مسیلمہ کو نبی مان لیں، مگر ہر مرتبہ وہ اس کے دعوائے رسالت کی شہادت دینے سے انکار کرتے تھے یہاں تک کہ اسی حالت میں کٹ کٹ کر انہوں نے جان دے دی۔ دوسری طرف عمارؓ بن یاسر ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد اور ان کی والدہ کو سخت عذاب دے دے کر شہید کر دیا گیا، پھر ان کو اتنی ناقابلِ برداشت اذیت دی گئی کہ آخر کار انہوں نے جان بچانے کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کفار اُن سے کہلوانا چاہتے تھے پھر وہ روتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ما ترکت حتی سببتک و ذکرت آلھتھم بخیر "یا رسول اللہ، مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک کہ میں نے آپ کو برا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہ کہہ دیا"۔ حضورؐ نے پوچھا کیف تجد قلبک "اپنے دل کا کیا حال پاتے ہو؟" عرض کیا مطمئنا بالایمان "ایمان پر پوری طرح مطمئن"۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا ان عادوا فعد "اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو تم پھر یہی باتیں کہہ دینا"۔

حاشیہ صفحہ ہذا

[۱۱۲] یہ فقرے اُن لوگوں کے بارے میں فرمائے گئے ہیں جنہوں نے راہِ حق کو کٹھن پا کر ایمان سے توبہ کر لی تھی اور پھر اپنی کافر و مشرک قوم میں جا ملے تھے۔

حال یہ ہے کہ جب (ایمان لانے کی وجہ سے) وہ ستائے گئے تو انہوں نے گھر بار چھوڑ دیے،
ہجرت کی، راہِ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا[۱]، اُن کے لیے یقیناً تیرا رب غفور رحیم
ہے [ع] (اِن سب کا فیصلہ اُس دن ہوگا) جبکہ ہر متنفس اپنے ہی بچاؤ کی فکر میں لگا ہوا ہوگا رکوع
اور ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہونے پائیگا۔
اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے۔ وہ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہی تھی اور ہر طرف سے
اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کر دیا۔ تب اللہ نے
اس کے باشندوں کو اُن کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا
گئیں۔ ان کے پاس ان کی اپنی قوم میں سے ایک رسول آیا مگر انہوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ آخر کار
عذاب نے ان کو آ لیا جبکہ وہ ظالم ہو چکے تھے[۲]۔
پس اے لوگو! اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان
کا شکر ادا کرو[۳] اگر تم واقعی اُسی کی بندگی کرنے والے ہو[۴]۔ اللہ نے جو کچھ تم پر حرام کیا ہے وہ ہے

---

[۱] اشارہ ہے مہاجرین حبشہ کی طرف۔

[۲] یہاں جس بستی کی مثال پیش کی گئی ہے اس کی کوئی نشان دہی نہیں کی گئی، نہ مفسرین یہ تعین کر سکے ہیں کہ یہ کونسی بستی ہے۔ بظاہر ابن عباس ہی کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خود مکے کو نام لیے بغیر مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت میں خوف اور بھوک کی جس مصیبت کے چھا جانے کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد وہ قحط ہوگا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کئی سال تک اہل مکہ پر مسلط رہا

[۳] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سورہ کے نزول کے وقت وہ قحط ختم ہو چکا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ گزر چکا ہے۔

[۴] یعنی اگر واقعی تم اللہ کی بندگی کے قائل ہو جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، تو حرام و حلال کے خود مختار نہ بنو۔ جس رزق کو اللہ نے حلال و طیب قرار دیا ہے اسے کھاؤ اور شکر کرو، اور جو کچھ اللہ کے قانون میں حرام و خبیث ہے اس سے پرہیز کرو۔

مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ البتہ بھوک سے مجبور ہو کر اگر کوئی ان چیزوں کو کھالے، بغیر اس کے کہ وہ قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کا خواہشمند ہو یا حدِّ ضرورت سے تجاوز کا مرتکب ہو، تو یقیناً اللہ معاف کرنے اور رحم فرمانے والا ہے[1]۔ اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو[2]۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔ دنیا کا عیش چند روزہ ہے۔ آخرکار اُن کے لیے دردناک سزا ہے۔

[3] وہ چیزیں ہم نے خاص طور پر یہودیوں کے لیے حرام کی تھیں جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے

---

[1] یہ حکم سورۂ بقرہ (رکوع ۲۱)، سورۂ مائدہ (رکوع ۱) اور سورۂ انعام (رکوع ۱۸) میں بھی گزر چکا ہے۔

[2] یہ آیت صاف تصریح کرتی ہے کہ خدا کے سوا تحلیل و تحریم کا حق کسی کو بھی نہیں، یا بالفاظِ دیگر قانون ساز صرف اللہ ہے۔ دوسرا جو شخص بھی جائز اور ناجائز کا فیصلہ کرنے کی جرأت کریگا وہ اپنی حد سے تجاوز کریگا، اِلّا یہ کہ وہ قانونِ الٰہی کو سند مان کر اُس کے فرامین سے استنباط کرتے ہوئے یہ کہے کہ فلاں چیز یا فلاں فعل جائز ہے اور فلاں ناجائز۔

اِس خود مختارانہ تحلیل و تحریم کو اللہ پر جھوٹ اور افترا اس لیے فرمایا گیا کہ جو شخص اِس طرح کے احکام لگاتا ہے اس کا یہ فعل دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ جسے وہ کتابِ الٰہی کی سند سے بے نیاز ہو کر جائز یا ناجائز کہہ رہا ہے اسے خدا نے جائز یا ناجائز ٹھیرایا ہے، یا اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ نے تحلیل و تحریم کے اختیارات سے دست بردار ہو کر انسان کو خود اپنی زندگی کی شریعت بنانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اِن میں سے جو دعویٰ بھی وہ کرے وہ لامحالہ جھوٹ اور اللہ پر افترا ہے۔

[3] یہ پورا پیراگراف اُن اعتراضات کے جواب میں ہے جو مذکورۂ بالا حکم پر کیے جا رہے تھے۔ کفارِ مکہ کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں تو اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں جن کو تم نے حلال کر رکھا ہے۔ اگر وہ شریعت خدا کی طرف سے تھی تو تم خود اس کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ اور اگر وہ بھی خدا کی طرف سے تھی اور یہ تمہاری شریعت بھی خدا کی طرف سے ہے تو دونوں میں یہ اختلاف (باقی ص ۳۱۶ پر)

کر چکے ہیں[1]۔ اور یہ اُن پر ہمارا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ہی ظلم تھا جو وہ اپنے اوپر کر رہے تھے۔ البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر برا عمل کیا اور پھر توبہ کرکے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح کے بعد تیرا رب اُن کے لیے غفور اور رحیم ہے۔ ع واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری امت تھا[2]، اللہ کا مطیع فرمان اور یک سو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا ع

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۵) کیسا ہے؟ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں سبت کی حرمت کا جو قانون تھا اس کو بھی تم نے اُڑا دیا ہے۔ یہ تمہارا اپنا خود مختارانہ فعل ہے یا اللہ نے اپنی دو شریعتوں میں دو متضاد حکم دے رکھے ہیں؟

[1] اشارہ ہے سورۂ انعام کی آیت وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ، الآیہ (رکوع ۱۸) کی طرف، جس میں بتایا گیا ہے کہ یہودیوں پر ان کی نافرمانیوں کے باعث خصوصیت کے ساتھ کون کونسی چیزیں حرام کی گئی تھیں۔

اس جگہ ایک اِشکال پیش آتا ہے۔ سورۂ نحل کی اس آیت میں سورۂ انعام کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ انعام اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی لیکن ایک مقام پر سورۂ انعام میں ارشاد ہوا ہے کہ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (رکوع ۱۴)۔ اس میں سورۂ نحل کی طرف صاف اشارہ ہے۔ کیونکہ مکی سورتوں میں سورۂ انعام کے سوا بس یہی ایک سورۃ ہے جس میں حرام چیزوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کونسی سورۃ پہلے نازل ہوئی تھی اور کونسی بعد؟ ہمارے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ پہلے سورۂ نحل نازل ہوئی تھی جس کا حوالہ سورۂ انعام رکوع ۱۴ کی مذکورہ بالا آیت میں دیا گیا ہے۔ بعد میں کسی موقع پر کفار مکہ نے سورۂ نحل کی ان آیتوں پر وہ اعتراضات وارد کیے جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس وقت سورۂ انعام نازل ہو چکی تھی۔ اس لیے ان کو جواب دیا گیا کہ ہم پہلے یعنی سورۂ انعام میں بتا چکے ہیں کہ یہودیوں پر چند چیزیں خاص طور پر حرام کی گئی تھیں۔ اور چونکہ یہ اعتراض سورۂ نحل پر کیا گیا تھا اس لیے اس کا جواب بھی سورۂ نحل ہی میں جملۂ معترضہ کے طور پر درج کیا گیا۔

[2] یعنی وہ اکیلا انسان بجائے خود ایک امت تھا۔ جب دنیا میں کوئی مسلمان نہ تھا تو ایک طرف وہ اکیلا اسلام کا علمبردار تھا اور دوسری طرف ساری دنیا کفر کی علمبردار تھی۔ اس اکیلے بندۂ خدا نے وہ کام کیا جو ایک امت کے کرنے کا تھا۔ وہ ایک شخص نہ تھا بلکہ ایک پورا ادارہ تھا۔

کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ دنیا میں اس کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔ پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ یک سو ہو کر ابراہیم کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔[۱] رہا سبت، تو وہ ہم نے اُن لوگوں پر مسلط کیا تھا جنہوں نے اس کے احکام میں اختلاف کیا۔[۲] اور یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان سب باتوں کا فیصلہ

---

[۱] یہ معترضین کے پہلے اعتراض کا مکمل جواب ہے۔ اس جواب کے دو اجزا ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی شریعت میں تضاد نہیں ہے، جیسا کہ تم نے یہودیوں کے مذہبی قانون اور شریعتِ محمدی کے ظاہری فرق کو دیکھ کر گمان کیا ہے، بلکہ دراصل یہودیوں کو خاص طور پر ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں چند نعمتوں سے محروم کیا گیا تھا جن سے دوسروں کو محروم کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرا جزء یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ ملتِ ابراہیمی میں وہ چیزیں حرام نہ تھیں جو یہودیوں کے ہاں حرام ہیں۔ مثلاً یہودی اونٹ نہیں کھاتے، مگر ملتِ ابراہیمی میں وہ حلال تھا۔ یہودیوں کے ہاں شُتر مرغ، بط، خرگوش وغیرہ حرام ہیں، مگر ملتِ ابراہیمی میں یہ سب چیزیں حلال تھیں۔ اس جواب کے ساتھ ساتھ کفارِ مکہ کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا گیا کہ نہ تم کو ابراہیمؑ سے کوئی واسطہ ہے نہ یہودیوں کو، کیونکہ تم دونوں ہی شرک کر رہے ہو۔ ملتِ ابراہیمی کا اگر کوئی صحیح پیرو ہے تو وہ یہ نبی اور اس کے ساتھی ہیں جن کے عقائد اور اعمال میں شرک کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

[۲] یہ کفارِ مکہ کے دوسرے اعتراض کا جواب ہے۔ اس میں یہ بیان کرنے کی حاجت نہ تھی کہ سبت بھی یہودیوں کے لیے مخصوص تھا اور ملتِ ابراہیمی میں حرمتِ سبت کا کوئی وجود نہ تھا، کیونکہ اس بات کو خود کفارِ مکہ بھی جانتے تھے۔ اس لیے صرف اتنا ہی اشارہ کرنے پر اکتفا کیا گیا کہ یہودیوں کے ہاں سبت کے قانون میں جو سختیاں تم پاتے ہو وہ ابتدائی حکم میں نہ تھیں بلکہ یہ بعد میں یہودیوں کی شرارتوں اور احکام کی خلاف ورزیوں کی وجہ سے ان پر عائد کر دی گئی تھیں۔ قرآن مجید کے اس اشارے کو آدمی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ ایک طرف بائیبل کے ان مقامات کو نہ دیکھے جہاں سبت کے احکام بیان ہوئے ہیں (مثلاً ملاحظہ ہو خروج باب ۲۰۔ آیت ۸-۱۱، باب ۲۳۔ آیت ۱۲-۱۳، باب ۳۱۔ آیت ۱۲-۱۷، (باقی ۳۲۱ پر)

کر دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

اَے نبی! اپنے ربّ کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۷) باب ۳۵۔ آیت ۲۔۳۔ گنتی باب ۱۵۔ آیت ۳۲۔۳۶) اور دوسری طرف اُن جبارتوں سے واقف نہ ہو جو یہودی سبت کی حرمت کو توڑنے میں ظاہر کرتے رہے (مثلاً ملاحظہ ہو یرمیاہ باب ۱۷، آیت ۲۱۔۲۷۔ حزقی ایل باب ۲۰۔ آیت ۱۲۔۲۴)

لہ یعنی دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔ ایک حکمت۔ دوسرے عمدہ نصیحت۔ حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔ رہی عمدہ نصیحت تو اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے، برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں اُن کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی اُبھارا جائے اور ان کے برے نتائج کا خوف دلایا جائے، اور اسی طرح ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے، بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔

سلہ یعنی اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی، اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود حریف مقابل کو چپ کر دینا (باقی صفحہ ۳۱۹ پر)

اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔ اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر بدلہ لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔ اَے محمدؐ! صبر سے کام لیے جاؤ ــــ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے ــــ اِن لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔ اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں[1] ع ع

(بقیہ حاشیہ ۳۱۸) اور اپنی زبان آدمی کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو۔ بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقہ سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اُتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گمراہی میں اور زیادہ دور نہ نکل جائے۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا

[1] یعنی جو خدا سے ڈر کر ہر قسم کے بُرے طریقوں سے پرہیز کرتے ہیں اور ہمیشہ نیک رویہ پر قائم رہتے ہیں۔ دوسرے ان کے ساتھ خواہ کتنی ہی برائی کریں، وہ ان کا جواب برائی سے نہیں بلکہ بھلائی ہی سے دیے جاتے ہیں۔

دارالکفر کے مُسلمان اور دارالاسلام

[یاد ہوگا کہ ماہ شعبان کے پرچے میں ایک صاحب کے سوال پر یہ مختصر جواب دیا گیا تھا کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں باہم شادی بیاہ اور توارث کے تعلقات نہ ہونے چاہئیں، کیونکہ قرآن کا منشا اس قسم کے تعلقات کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس پر جو اعتراضات ہندوستان و پاکستان کے بعض ایسے حلقوں کی طرف سے ہوئے ہیں جنہیں اس مسئلے کی الف بے تک کا علم نہیں ہے وہ تو چنداں قابل توجہ نہیں ہیں۔ البتہ اس باب میں جناب مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب سے ہماری جو مراسلت ہوئی ہے وہ علمی حیثیت سے اس لائق ہے کہ اسے فائدۂ عام کے لیے شائع کیا جائے۔]

مولانا ظفر احمد صاحب کا مکتوب

مکرمی مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب! زادت محاسنکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مجھے آپ سے غائبانہ محبت ہے جس کی شہادت خود آپ کا ضمیر دے گا اور میرا یہ طرزِ عمل بھی کہ میں گاہے گاہے تھانہ بھون اور ڈھاکہ سے آپ کو از خود لکھتا رہا ہوں۔ یہ خط بھی اسی غائبانہ محبت کی بنا پر از خود لکھ رہا ہوں۔ مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ آج کل بعض علماء نے آپ کی تکفیر و تفسیق کے لیے فتویٰ نویسی شروع کر دی ہے، اور آپ کو جماعتِ اہلِ حق سے جدا سمجھ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اہلِ حق سے الگ نہ کرے۔ پھر کسی کے الگ کرنے کی پروا نہیں ؎

لکل شیئ اذا فارقته عوض
ولیس للہ ان فارقت من عوض

میں نے ترجمان القرآن میں ایک مخدوم زادہ بزرگ کا مضمون پڑھا۔ افسوس ہے کہ انہوں نے تصور شیخ کی وہی تصویر پیش کی ہے جس کی بنا پر محققین نے اس کی تعلیم موقوف کی تھی۔ تصور شیخ کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وصول الی اللہ کے لیے قلب کو حُبّ دنیا اور علائق ماسویٰ اللہ سے پاک وصاف کرنا ضروری ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہر چیز کی محبت کو ایک ایک کر کے الگ الگ نکالا جائے۔ یہ راستہ طویل بھی ہے اور بعض کے لیے دشوار بھی۔ اس لیے بعض محققین نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان سب پر کسی ایک کی محبت کو غالب کر دیا جائے۔ اس کے غلبہ سے دوسری اشیاء کی محبت مغلوب ومضمحل ہو کر معدوم یا کالعدم ہو جائے گی۔ پھر اس ایک کی محبت کا مغلوب کرنا یا نکالنا زیادہ دشوار نہ ہوگا۔ اس کے لیے محبتِ شیخ کو تجویز کیا گیا کہ اس سے طالب کو فی الجملہ محبت ہوتی ہی ہے اور چونکہ یہ محبت لوجہ اللہ ہے اس لیے اس کا غلبہ محبتِ حق میں معین ہوگا، اس سے مانع نہ ہوگا۔ جب غلبۂ حبِ شیخ سے دوسری اشیاء کی محبت مغلوب ہو جائے تو حُبِ شیخ کو مغلوب کرنے کے لیے تصور رسول کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد فنا فی اللہ کا راستہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ مگر جب کم فہموں نے تصور شیخ کا مطلب وہ سمجھ لیا جو ہمارے مخدوم زادہ بزرگ نے بیان فرمایا ہے تو محققین نے اس کی تعلیم موقوف کر دی اور اس کو ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون کا مصداق تبلایا۔ اس مسئلہ میں آپ کے رسالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی میں دوسرے مسئلہ میں اپنے مخدوم زادہ کی تصدیق کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کی جماعت کے بعض افراد قرآن وحدیث سے براہِ راست استنباط کرنا چاہتے ہیں، اور اس کی پروا نہیں کرتے کہ وہ استنباط فقہاءِ امت کے موافق ہے یا خلاف

اس کی تازہ مثال ترجمان القرآن جلد ۳۶ عدد ۲ بابت شعبان ۱۳۷۰ھ مطابق جون ۱۹۵۱ء میں ابھی ابھی میری نظر سے گذری۔ آپ نے دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں کے تعلقات کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "جہاں تک مجھے علم ہے قرآن کا نشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں" پھر ان مہاجرین کے متعلق جن کے ایسے رشتہ دار دارالکفر میں رہ گئے ہوں جن کے وہ وارث ہو سکتے ہیں فرمایا ہے کہ "ان کے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ نہ وہ ہندوستان میں میراث پا سکتے ہیں اور نہ ان کے ہندوستانی رشتہ دار پاکستان میں ان سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں" الخ ص ۱۲۵/۶۱

آپ کا یہ فتویٰ مذہب حنفی اور جملہ مذاہب اربعہ کے خلاف ہے اور جس آیت سے آپنے یہ استنباط کیا ہے (والذین آمنوا ولم یہاجروا ما لکم من ولایتہم من شیئ حتی یہاجروا) اس میں اگر ولایت کو بمعنی وراثت تسلیم کر لیا جائے، موالات کے معنی میں نہ لیا جائے، تو یہ حکم اس وقت کا ہے جبکہ ابتداء قدوم مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ قائم کر دی تھی، جس کی بنا پر مہاجرین انصار کے اور انصار مہاجرین کے وارث ہوتے تھے۔ جس کی دلیل اسی آیت کا یہ ٹکڑا ہے ان الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اولئک بعضھم اولیاء بعض ط۔

پھر جب مہاجرین و انصار کا باہم توارث سورہ الاحزاب کی آیت النبی اولی بالمومنین من انفسھم وازواجہ امھاتھم واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ من المومنین والمہاجرین الا ان تفعلوا الی اولیاءکم معروفا کان ذالک فی الکتاب مسطورا۔ سے منسوخ ہو گیا تو اب یہ حکم باقی نہ رہا کہ مسلم مہاجر مسلم غیر مہاجر کا وارث نہ ہو، یا برعکس۔ بلکہ آیت المواریث کے موافق توارث

ہونے لگا۔

پھر آپ نے اس پر بھی غور نہ کیا کہ سورۂ الممتحنہ کی آیت ولا تمسکوا بعصم الکوافر واسئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا کے نزول سے پہلے تک غیر مسلم عورتیں صحابہ مہاجرین کے نکاح میں بدستور رکھی ہیں تھیں۔ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ وغیرہ نے اپنی کافر عورتوں کو طلاق دے دی تو اُن کا نکاح مکہ کے کافروں سے ہوا۔ حالانکہ مکہ اس وقت صرف دارالکفر ہی نہ تھا بلکہ وہاں کے باشندے محارب بھی تھے جن سے غزوۂ حدیبیہ ۶ھ میں چند سال کے لیے صلح کی گئی تھی۔ تو جس دارالکفر کے باشندے برسر جنگ نہ ہوں وہاں کی مسلمان عورتوں سے شادی بیاہ کو اور وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ توارث کو آپ کس دلیل سے منع کر سکتے ہیں؟

آج ہندوستان جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی برطانیہ کی حکومت میں تھا اور آج جیسا پاکستان دارالاسلام ہے ویسا ہی کسی وقت حیدرآباد بھی دارالاسلام تھا بلکہ کچھ زیادہ کہ وہاں محکمۂ امور مذہبی قائم تھا جو اب تک پاکستان میں قائم نہیں ہوا۔ تو کیا آپ اس وقت ہندوستان اور حیدرآباد کے مسلمانوں میں باہم شادی بیاہ اور توارث کو ممنوع سمجھتے تھے؟ یا اس وقت اگر کوئی حاجی مہاجر ہو کر مکہ مدینہ میں رہ جاتا اور اس کی موت کے وقت مکہ مدینہ میں اُس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو آپ یہ فتویٰ دے سکتے تھے؟ کہ اُس کے ہندوستانی رشتہ داروں کو اس کا ترکہ نہ دیا جائے؟

اگر آپ یہ فتویٰ دیتے ساری دنیا آپ کی مخالفت کرتی۔ حکومت حجاز کا تعامل ترکی کے زمانہ میں بھی اور آج بھی یہی رہا ہے اور ہے کہ ایسے لوگوں کا ترکہ ہندوستان کی حکومت کے ذریعہ سے اُن کے ہندوستانی ورثہ کو دے دیا جاتا تھا جبکہ ثبوت مل جاتا کہ اس کے ورثہ موجود ہیں۔ کسی مذہب کے علماء نے بھی حکومت حجاز کو یہ فتویٰ نہیں دیا کہ ان حاجیوں کا مال ہندوستانی ورثہ کا نہیں بلکہ حکومت کا حق ہے۔

اور اگر آیت انفال سے مراد ولایت بمعنی وراثت نہیں بلکہ بمعنی موالات ہے تو اس کو میراث اور نکاح سے کوئی علاقہ نہ ہوگا، بلکہ موالات اور ترک موالات کا اس میں بیان ہوگا جس میں محاربین اور غیر محاربین کا فرق بھی ہوگا اور مستامن وغیر مستامن کا بھی۔ جس کی تفصیل سورۃ الممتحنہ کی آیات لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین۔ الآیہ کے تحت مفسرین ومحدثین وفقہاء نے بہت کچھ بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو شرح السیر الکبیر للامام محمد بن الحسن الشیبانیؒ۔

اخیر میں خیر خواہی کے ساتھ چند باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

(ا) قرآن سے مسائل واحکام کا استنباط کرتے ہوئے کم از کم احکام القرآن للرازیؒ احکام القرآن لابن العربیؒ تفسیر روح المعانی اور بیان القرآن لحکیم الامۃ التھانوی سے مراجعت ضرور کرلیا کریں۔

(ب) فتویٰ دینے سے پہلے فقہاء حنفیہ کی کتابوں اور اہل فتویٰ علماء سے مراجعت فرمالیا کریں۔ کیونکہ فتویٰ نویسی محض کتابوں کے مطالعہ سے نہیں آتی۔ اس کے لیے اہل افتاء کے پاس رہ کر مدتوں کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(ج) ہم اور آپ مذہب حنفی کے سوا دوسرے مذاہب سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، کیونکہ یہاں دوسرے مذاہب کا درس دینے والے محقق علماء موجود نہیں ہیں۔ اور محض کتابوں میں دوسرے ائمہ کے اقوال دیکھ لینے سے اُن کے مذہب کا پورا علم نہیں ہوسکتا۔ آپ دیکھیں گے کہ ہماری کتابوں میں بعض مسائل کے متعلق دوسرے ائمہ کا مذہب غلط لکھ دیا گیا ہے۔ جیسا اُن کی کتابوں میں ہمارا مذہب بعض مسائل میں غلط نقل ہوگیا ہے۔ حافظ ابوبکر بن ابی شیبہ جیسا محدث، جس کا وظیفہ ہی یہ ہے کہ ہر بات سند کے ساتھ کہے، اپنی مصنف کے باب الرد علی ابی حنیفہ میں بہت سے مسائل امام صاحب کی طرف غلط منسوب کر گیا ہے جس کا کتب حنفیہ میں پتہ بھی نہیں۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ

جبتک کسی مذہب کو اسی کے علماء سے باقاعدہ نہ پڑھا جائے اس وقت تک اس سے پوری واقفیت نہیں ہو سکتی بعض دفعہ مسئلہ صحیح نقل ہوتا ہے مگر اُس میں جس قدر تفصیل و قیود اصل مذہب میں ہیں وہ سب نقل نہیں کی جاتیں۔

چنانچہ امرأۃ المفقود کے مسئلہ میں ہماری کتابوں میں امام مالک کا مذہب بہت مجمل بیان کیا گیا ہے۔ جب اس مسئلہ کی تحقیق علماء مالکیہ سے کی گئی تو اس میں بڑی تفصیل معلوم ہوئی اور بہت سی قیود و شرائط کا علم ہوا جن کا ہماری کتابوں میں پتہ بھی نہیں۔ ملاحظہ ہو رسالہ الحیلۃ الناجزہ لحکیم الامۃ التھانویؒ۔ پس کسی مسئلہ میں مذہب حنفی کو چھوڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ ہم نے مذاہب اربعہ سے خروج نہیں کیا اُس وقت تک قابلِ قبول نہیں جب تک دوسرے مذاہب کے علماء سے اُس مسئلہ میں مراجعت نہ کر لی جائے۔

(د) نسبت صوفیہ غنیمت کبریٰ اما رسوم ایشاں بہیچ نیرزد۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے اس مقولہ کو پیشِ نظر رکھ کر نسبت صوفیہ کے حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جائے کیونکہ اس کے بغیر درجۂ احسان حاصل نہیں ہوتا جس پر کمالِ ایمان موقوف ہے۔ اور اس نسبت کے لیے رسومِ صوفیہ یا ان کے اشغالِ مروجہ کی اصلاً ضرورت نہیں مگر اہل نسبت کی صحبت ازبس ضروری ہے ؎

قال را بگذار مردِ حال شو   پیشِ مردے کاملے پامال شو

آپ کے قریب ہی . . . . تشریف فرما ہیں۔ گاہے گاہے اُن کے پاس جاتے رہا کریں۔ امید ہے کہ میری ان باتوں کو خیر خواہی پر محمول کیا جائے گا اور اسی نظر سے خط کو دیکھا جائے گا۔ والسلام

ظفر احمد

جواب

مکرمی ومحترمی مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔ عنایت نامہ مورخہ ۲۵ جولائی مجھے ذرا دیر سے ملا۔ اسی لیے جواب بھی بتاخیر حاضر ہو رہا ہے۔ اس میں میری کوتاہی نہیں ہے۔

میں آپ کے اخلاص ومحبت کا دل سے شکر گزار ہوں، اور مزید شکر گزاری کی موجب وہ علمی رہنمائی ہے جو آپ نے ازراہِ کرم عنایت فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

فتاویٰ کے بارے میں جناب نے بالکل سچ فرمایا۔ میری بھی غایت تمنا بس یہی ہے کہ اللہ کے دربار سے نہ دھتکارا جاؤں، اس کے بعد مذہبی درباروں سے دھتکار دیے جانے کی مجھے پروا نہیں ہے۔

تصورِ شیخ کی جو تعبیر آپ نے پیش فرمائی ہے اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں۔ تدبیر کی حد تک اسے مباح مانا جائے گا اگر آدمی اسی نیت سے اس تدبیر کو اختیار کرے جو آپ نے بیان فرمائی ہے۔ البتہ جو تعبیر حکیم عبدالرشید صاحب نے پیش فرمائی تھی وہ تو سخت خطرناک تھی اور مولانا امین احسن صاحب نے جو گرفت کی تھی اسی پر کی تھی۔

آپ کا یہ ارشاد بجا ہے کہ قرآن سے مسائل واحکام کا استنباط کرتے ہوئے جصاص اور ابن العربی کی احکام القرآن اور تفسیر روح المعانی اور بیان القرآن کا مطالعہ کر لیا جائے۔ الحمدللہ کہ میں پہلے ہی اس مشورے پر عامل ہوں۔ مولانا تھانوی کی بیان القرآن تو میرے پاس نہیں ہے۔ البتہ متقدم الذکر تینوں کتابیں موجود ہیں اور ہمیشہ آیات سے احکام معلوم کرنے میں تینوں کو بغور دیکھ لیتا ہوں۔ اور صرف انہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ابن کثیر، ابن جریر، اور تفسیر کبیر سے بھی مراجعت کر لیتا ہوں تاکہ مسئلے کے تمام اطراف سامنے آجائیں۔ اس لیے آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں تحقیق ومطالعہ کے بغیر ہی اظہار رائے کر دینے کا عادی ہوں۔ البتہ ایک چیز ضرور ہے جس میں میرا طریقہ آپ حضرات سے مختلف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا، اور جب میرا ان کے

بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

فتویٰ دینے کی غلطی میں نے آج تک کبھی نہیں کی۔ فتویٰ جو شخص بھی مجھ سے پوچھتا ہے، میں ہمیشہ اس کو یہی جواب دیتا ہوں کہ مجھے منصب افتا حاصل نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ مسائل میں میری تحقیق پوچھتے ہیں ان کو اپنے علم کے مطابق جواب دے دیتا ہوں۔ اور جواب دیتے وقت فقہ کی مستند کتابوں سے مراجعت کرنے کا پورا التزام کرتا ہوں۔ مطالعہ و تحقیق کے بغیر اظہار رائے سے میں نے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی محض اظہار رائے پر اکتفا کر جاتا ہوں اور دلائل و مآخذ بیان کرنے کا موقع نہیں پاتا۔

آپ کا یہ ارشاد بھی بجا ہے کہ کتابوں میں بالعموم اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذاہب کے اقوال ثبت کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس چیز کو میں نے خود محسوس کیا ہے۔ اس لیے میں مذہب حنفی کے سوا دوسرے مذاہب کے اقوال معلوم کرنے کے لیے صرف اُن کتابوں پر اکتفا نہیں کرتا جو فقہاءِ حنفیہ نے لکھی ہیں بلکہ خود ان مذاہب کی اصل کتابیں بھی دیکھ لیتا ہوں۔ مثلاً مذہبِ حنبلی کے لیے المغنی لابن قدامہ، اور مذہبِ مالکی کے لیے المدونہ، وغیرہ۔ نیز میرا تجربہ ہے کہ مذاہب اربعہ کے اقوال کو الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں کافی احتیاط کے ساتھ ثبت کیا گیا ہے اور بدایۃ المجتہد بھی اس معاملہ میں نسبۃً خاصی قابلِ اعتماد ہے۔ شوکانی کو بھی میں نے اس معاملہ میں خاصا محتاط پایا ہے، اگرچہ بعض مقامات پر انہوں نے مذاہب کے نقل میں غلطیاں کی ہیں۔ بہرحال ایک مسئلے کی تحقیق میں بہت سے مراجع کی طرف رجوع کرنے سے قریب قریب صحیح واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

صوفیہ کی صحبت سے میں نے اکثر استفادہ کیا ہے۔ ایک مدت تک میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ جس باخدا بزرگ کا بھی پتہ چلا اس سے ضرور جا کر ملا اور ان کی صحبت میں بیٹھا۔ میرا اپنا خاندان بھی اہلِ تصوف ہی میں سے ہے اور میرے والد مرحوم تک بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ تصوف کا لٹریچر بہت مطالعہ بھی میں نے کیا ہے اور متعدد صوفی بزرگوں سے توجہ لینے اور اشتغال

سیکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اِس لیے تصوف اور اہلِ تصوف کے بارے میں اپنے جن خیالات اور آراء کی بنا پر مَیں بدنام ہوں انہیں آپ ایک ایسے شخص کے خیالات اور آراء نہ سمجھیں جو اس کوچہ سے بالکل نابلد ہے۔ مَیں نے تصوف کو بھی دیکھا ہے اور اہلِ تصوف کو بھی، اور اس کے اچھے اور برے پہلو دیکھ کر ہی ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔ مَیں نہیں کہتا کہ جس نتیجے پر مَیں پہنچا ہوں اُسے ہر شخص مان لے۔ البتہ یہ ضرور عرض کرتا ہوں کہ میری رائے کو محض ایک سطحی رائے سمجھنے کی غلطی دوسرے لوگ بھی نہ کریں۔ اب بھی مجھے کسی صاحبِ کمال سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں ہے اور میری ہر رائے نظرِ ثانی کے قابل ہے۔ لیکن میں اس کو کیا کروں کہ بہت سے لوگ جنہیں صاحبِ کمال کہا جاتا ہے، مَیں نے اپنے تجربہ میں ان کو ناقص پایا ہے۔ انہی میں سے ایک وہ بزرگ بھی ہیں جن سے فیض حاصل کرنے کا آپ نے مشورہ دیا ہے۔

اب میں اس مسئلے کی طرف آتا ہوں جس پر آپ نے تفصیلی گرفت فرمائی ہے۔ میں نے اس پر جس اختصار کے ساتھ اظہار رائے کیا تھا، اسے دیکھ کر شاید آپ نے یہ گمان فرمایا کہ میں اس مسئلے میں فقہاء کے ارشادات سے ناواقف ہوں اور قرآن کی صرف ایک آیت دیکھ کر اظہار رائے کر بیٹھا ہوں، حالانکہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ دارالکفر کی مسلمان رعایا اور دارالاسلام کی حکومت اور مسلم رعایا کے باہمی تعلقات کا معاملہ سخت پیچیدہ ہے اور اس معاملہ میں مَیں نے فقہاء کے بیانات کو بہت ناکافی پایا ہے۔ متقدمین کو تو اس مسئلے سے کچھ زیادہ سابقہ پیش نہیں آیا تھا، اس لیے انہوں نے اس کے سارے اطراف کھول کر بیان نہیں کیے۔ رہے متاخرین، تو ان کو اس سے سابقہ ضرور پیش آیا، مگر وہ نہ تو متقدمین سے کچھ زیادہ مفصل رہنمائی پاسکے اور نہ خود ہی اجتہاد کی جرأت کر سکے۔ اب جو ہم اپنی آزاد حکومت لے کر بیٹھے ہیں تو ہمیں پھر اس مسئلے سے سابقہ پیش آرہا ہے اور قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پچھلی کتب فقہ اس معاملہ میں ہماری پوری رہنمائی نہیں کرتیں۔ آپ خود ذرا اُن احکام کو جمع فرمائیں جو اس مسئلے کے متعلق کتب فقہ میں ملتے ہیں، اور پھر دیکھیں کہ کیا وہ ہمارے اس وقت کے حالات میں تمام مسائل کا شافی جواب دیتے ہیں؟

دارالاسلام کی حکومت اور مسلم رعایا، اور دارالکفر کی مسلم رعایا کے باہمی تعلقات کا معاملہ محض قانونی نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر سیاسی اور بین الاقوامی تعلقات کے مسائل بھی ساتھ ساتھ اُلجھے ہوئے ہیں۔ ایک مسلمان جو دارالاسلام کی رعایا ہے، اگر دارالکفر کے کسی شخص کا وارث ہو اور اس کا مفاد اس وراثت سے وابستہ ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہی وابستگی اس کے لیے فتنہ بن جائے۔ ایک لڑکی جو دارالکفر کی رعایا ہے اور جس کے اعزہ اقربا سب دارالکفر میں رہتے ہیں اور وہاں اپنے مفادات رکھتے ہیں، اگر دارالاسلام میں بیاہی ہوئی آئے تو ہو سکتا ہے کہ اسے غیر مسلموں کی بہ نسبت زیادہ آسانی کے ساتھ جاسوسی کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ ایک عورت جو ہجرت کر کے دارالاسلام میں آچکی ہے یا دارالاسلام ہی کی رہنے والی ہے، اس کا شوہر اگر دارالکفر کا باشندہ ہو اور ہجرت کے لیے تیار نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ ہم نہ اس عورت کو اس سے نفقہ دلوا سکتے ہیں۔ نہ ہماری کسی عدالت کا کوئی اختیار اس شخص پر نافذ ہوتا ہے کہ ہم کسی حق کا استقرار کرا سکیں۔ لامحالہ ہمیں اس عورت کو یا تو تمام حقوق سے محروم رکھنا پڑے گا، یا پھر اسے دارالکفر بھیجنا پڑے گا۔ اس طرح کی بہت سی پیچیدگیاں ان معاملات میں پائی جاتی ہیں جو نری قانونی نوعیت کی نہیں ہیں۔

پھر اس معاملہ میں متعدد معاشی پیچیدگیاں بھی ہیں۔ دارالکفر کی حکومت اپنے علاقہ میں دارالاسلام کی رعایا کے حقوق مالکانہ ساقط کر سکتی ہے یا ان کو طرح طرح کی پابندیوں سے محدود کر سکتی ہے اور دارالاسلام کی طرف دولت کے منتقل ہونے کو روک سکتی ہے۔ مگر ہم دارالاسلام میں دارالکفر کے ایک مسلمان کے حقوق وراثت مان لینے کے بعد انہیں کیسے ساقط کر سکیں گے اور دارالاسلام کے ایک مسلمان کو اپنی دارالکفر میں رہنے والی بیوی کا نفقہ یا مہر ادا کرنے سے کس طرح روک سکیں گے جبکہ یہ شرعی حقوق ثابت ہوں؟ اس طرح دولت کا یک طرفہ بہاؤ شروع ہو جائے گا جو دارالاسلام کے لیے مضر اور دارالکفر کے لیے مفید ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ دارالکفر میں کروڑوں مسلمان رعایا کی حیثیت سے آباد ہوں اور دارالاسلام کے بے شمار مسلمانوں سے ان کے تعلقات ہوں یہ نقصان ناقابلِ لحاظ بھی نہیں رہتا۔

مَیں اس پیچیدگی پر بہت غور کرتا رہا ہوں اور مجھے نہ کتب فقہ میں اس کا شافی حل مل سکا ہے اور نہ اُن معاملات میں جو ابتداءً چند سال تک مدینہ طیبہ اور مکہ کے مسلمانوں کے درمیان رہے تھے۔ اس لیے مَیں نے قرآن مجید سے اس کا حل معلوم کرنے کی کوشش کی اور مَیں نے یہ سمجھا کہ آیت والذین آمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیئٍ حتی یھاجروا وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علیٰ قوم بینکم وبینھم میثاق میں اس کا مکمل جواب موجود ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس آیت سے کیا احکام مستنبط ہوتے ہیں اور کس طرح ہوتے ہیں۔

اس آیت میں سب سے اہم لفظ "ولایت" ہے جس کے معنی کا تعین ضروری ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کو مجرد وراثت یا اور کسی ایک معنی پر منحصر کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کی پوری وسعت کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ نصرت، سرپرستی، حمایت، نگہبانی، اور قرابت کے مفہومات پر حاوی ہے۔ ان مفہومات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ "ولایت" سے مراد ایک طرف تو وہ تعلق ہے جو ایک ریاست اور اس کے شہریوں کے درمیان ہوتا ہے، اور دوسری طرف وہ تعلق جو ایک ریاست کے شہریوں میں باہم ہوتا ہے، اور اس کے حدود اُن تمام اقسام کے روابط پر وسیع ہیں جن پر لغت کے اعتبار سے لفظِ ولایت کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ دار الاسلام کی حکومت صرف دار الاسلام ہی کے مسلمانوں کی ولی ہو اور اس کو دار الکفر کے مسلمانوں کی "ولایت" سے سبکدوش کر دیا جائے تا کہ وہ بین الاقوامی پیچیدگیوں میں مبتلا نہ ہو اور ایسے فرائض سے گرانبار بھی نہ ہو جنہیں ادا کرنا عملاً محال ہے۔ اس کے ساتھ قرآن کا منشا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دار الاسلام کی مسلم رعایا اور دار الکفر کی مسلم رعایا کے درمیان بھی ولایت کے یہ تعلقات نہ ہوں، بلکہ ان روابط کو دار الاسلام ہی کے مسلمانوں تک محدود رکھا جائے۔

ولایت کا یہ مفہوم اور منشا متعین ہو جانے کے بعد اس آیت سے جو ہدایات نکلتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) دارالکفر کی مسلم رعایا کی حمایت و نصرت، سرپرستی و نگہبانی اور پشتیبانی دارالاسلام کی حکومت کے ذمہ نہیں ہے۔ یہی مطلب اُس حدیث کا بھی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے (انا بریٔ من کل مسلم بین ظھرانی المشرکین۱)۔ البتہ اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد مانگیں تو بشرطِ طاقت اُس کافر قوم کے خلاف ان کی مدد کی جاسکتی ہے جس سے ہمارا معاہدہ نہ ہو۔

(۲) دارالکفر کا کوئی مسلمان جو بدستور دارالکفر ہی کی رعایا بنا رہے، دارالاسلام میں آکر مسلمانوں کے ساتھ اُن کے حقوق شہریت میں حصہ دار نہیں ہو سکتا، نہ یہ جائز ہے کہ دارالاسلام کی حکومت میں اُسے کوئی ذمہ داری کا عہدہ دیا جائے۔ یہ حقوق اور یہ مناصب اُسے صرف اُسی صورت میں مل سکتے ہیں جبکہ وہ ہجرت کر کے آجائے۔

(۳) دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، اِلّا یہ کہ دونوں حکومتوں اور قوموں کے درمیان قابلِ اعتماد دوستانہ تعلقات ہوں (لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم وتقسطوا الیھم۲) اور ان کے درمیان املاک اور مواریث کے بارے میں مساویانہ معاہدات بھی ہو جائیں تاکہ دونوں کی رعایا ایک دوسرے کی مملکت میں جائدادوں کی مالک و متصرف ہو سکے۔ اس معاملہ میں آپ نے واولوا الارحام بعضھم اولیٰ ببعض سے جو معارضہ فرمایا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ محض مواخاۃ کی بنا پر انصار اور مہاجرین ایک دوسرے کے وارث نہ ہونگے بلکہ وراثت رشتۂ نسب و مصاہرت کی بنا پر ہوگی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ آیت دارالاسلام کے مسلمانوں کی میراث اُن اولوالارحام کو پہنچانا چاہتی ہے جو دارالکفر میں رعایا کی حیثیت سے رہتے ہوں اور یہ مطلب آخر کیسے نکالا جا سکتا ہے جبکہ قرآن صاف فیصلہ کر چکا ہے

---

۱ میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔

۲ اللہ تمہیں اس سے نہیں روکتا کہ تم اُن غیر مسلموں سے تعلقات رکھو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے، یہ کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان سے انصاف کرو۔

کہ ان الذین امنوا وھاجروا ۔ ۔ ۔ ۔ والذین اٰووا ونصروا اولئک بعضھم اولیاء بعض[1]

(۴) دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں کے درمیان جب ولایت کا تعلق نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ کفاءت کا تعلق بدرجۂ اولیٰ نہیں ہے۔ اس لیے کم از کم جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے درمیان مناکحت پسندیدہ نہیں ہے۔ وہ باہم شادی بیاہ کریں تو نکاح منعقد تو ہو جائے گا لیکن اچھا یہ ہے کہ وہ ایسا نہ کریں، اور اسلامی حکومت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس طرح کے رشتوں میں انتظامی احکام کے ذریعہ سے رکاوٹیں ڈالے۔ اور بعض خاص حالات میں ان کو روک دے۔ نیز یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جن کے درمیان پہلے نکاح ہو چکے تھے، اب محض اختلافِ دار کی بنا پر وہ ٹوٹ گئے لیکن اگر ایک منکوحہ عورت، جو دارالاسلام کی رہنے والی ہو، یا ہجرت کر کے دارالاسلام آچکی ہو، عدالت میں اس بنا پر فسخ نکاح کی درخواست کرے کہ اس کا شوہر دارالکفر کی رعایا ہے اور ہجرت کے لیے تیار نہیں ہے۔ تو یہ اس کی درخواست کو منظور کرنے کے لیے ایک معقول وجہ ہوگی۔ اس لیے کہ اسلامی حکومت اس عورت کے معاملات کی تو متولی ہے اور اس کے حقوق کی نگہداشت اس کا فرض ہے۔ مگر اس کا شوہر اس حکومت کی ولایت سے خارج ہے جس کی بنا پر اس عورت کا کوئی حق بھی اس سے وصول کر کے نہیں دلایا جاسکتا۔ لہٰذا اگر یہ حکومت اسے اس شوہر کی قیدِ نکاح سے نہ چھڑائے گی تو فرائضِ ولایت ادا کرنے میں قاصر رہے گی۔ آپ غور فرمائیں تو یہ بات آپ کو بھی عجیب معلوم ہوگی کہ جس کے ہم ولی نہیں ہیں اس کے حقوق کے تو ہم نگہبان بن کر بیٹھ جائیں مگر جس کے ہم ولی ہیں اس کا کوئی حق بھی نہ دلوائیں اور نہ دلوا سکیں۔

میرے نزدیک اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کا تقاضا بس یہ ہے کہ جس عورت کے پاس نفقہ موجود ہو اور جس کے مبتلائے فتنہ ہو جانے کا بھی کوئی معقول احتمال نہ ہو اس کے لیے تو ایک مناسب مدتِ انتظار تجویز کر دی جائے کہ اس مدت کے اندر اگر اس کا شوہر ہجرت کر کے آجائے تو

---

[1] جو لوگ ایمان لائے اور (دارالاسلام میں) ہجرت کر کے آگئے ۔ ۔ ۔ ۔ اور جنہوں نے مہاجرین کو (دارالاسلام میں) جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

وہ عورت اسی کی ہو گی، ورنہ اس کے بعد نکاح فسخ ہو جائے گا اور عورت آزاد ہو گی کہ جہاں چاہے نکاح کر لے۔ لیکن جس عورت کے پاس نفقہ نہ ہو، یا جس کے مبتلائے فتنہ ہونے کا معقول احتمال ہو اس کا نکاح بلاتاخیر فسخ کیا جانا چاہیے۔ ہم دارالکفر کے کسی شخص کی خاطر دارالاسلام کی کسی عورت کو نہ تو بھوکا مار سکتے ہیں اور نہ اسے قذف اور زنا کے خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔

آیت لا تمسکوا بعصم الکوافر سے اس موقع پر آپ نے جو استدلال فرمایا ہے وہ بالکل بے محل ہے۔ ہجرت کے موقع پر مہاجرین کے نکاح میں مکہ کی جو غیر مسلم عورتیں تھیں ان کو اس لیے طلاق نہ دی گئی تھی کہ اُس وقت[1] تک مشرکین و مشرکات کے ساتھ مناکحت کی حرمت کا حکم نہ آیا تھا۔ اسی بنا پر وہ مسلمان عورتیں بھی مشرکین کے نکاح میں رہیں جو ہجرت کر کے مدینہ چلی گئی تھیں۔ پھر دونوں مملکتوں کے درمیان حالتِ جنگ قائم ہو گئی جس کی بنا پر ایک مدت تک یہ طے ہونا مشکل تھا کہ مہاجرین اپنا خرچ کیا ہوا مال مشرکین سے لے کر اپنی مشرک بیویوں کو چھوڑ دیں، اور مشرکین کو ان کا خرچ کیا ہوا مال واپس دے کر ان کی مسلمان بیویوں کو ان کی قید نکاح سے آزاد کرا لیا جائے۔ اس لیے یہ معاملہ صلح حدیبیہ تک ٹلتا رہا اور صلح کے بعد حکم آیا کہ ولا تمسکوا بعصم الکوافر وسئلوا ما انفقتم و لیسئلوا ما انفقوا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس معاملہ سے آپ زیرِ بحث مسئلہ میں کیا دلیل لا سکتے ہیں اور کیسے؟

آپ نے حیدر آباد اور حجاز اور ٹرکی کے تعامل سے جو استدلال فرمایا ہے وہ اس قابل نہ تھا کہ آپ جیسا ذی علم اسے پیش کرتا۔ حیدر آباد کی حکومت اپنے محکمۂ امورِ مذہبی کے باوجود دارالاسلام نہ تھی۔ اس کی حیثیت تو دارالکفر کے اندر ایک ذمی ریاست (Protected State) کی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان بھی انگریز کے ذمی تھے اور نظام حیدر آباد بھی۔ نظام کی حکومت نے اگر کچھ اسلامی طریقے جاری رکھے تھے تو وہ اُس کے بل بوتے پر نہ تھے بلکہ اس بنا پر تھے کہ انگریز نے اسے ان کی اجازت دے رکھی تھی۔ باقی ماندہ پورے اسلام کو اگر نظام قائم کرنا چاہتا بھی تو نہ کر سکتا تھا کیونکہ انگریز اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایسی حکومت کو آخر کس بنا پر دارالاسلام کہا جا سکتا ہے؟

[1] یعنی ہجرت کے وقت

بخلاف اس کے پاکستان میں پورے اسلام کے قیام کا دستوری اعلان ہو چکا ہے اور عملاً اس کے قیام میں اگر کوئی چیز مانع ہے تو وہ پاکستان کے اپنے ہی حکام کا تساہل ہے نہ کہ کسی غیر مسلم طاقت کا تسلط۔ اس لیے پاکستان اور حیدر آباد کے درمیان سرے سے کوئی وجہِ مماثلت موجود ہی نہیں ہے کہ ایک کے مسائل کو دوسرے کے مسائل پر قیاس کیا جاسکے۔ رہا ٹرکی اور حجاز کا معاملہ، تو اُن ممالک کے علماء کی جو رائے تھی اسی پر وہاں عمل ہوتا رہا۔ کیا ضروری ہے کہ مَیں ان کی رائے سے اتفاق ہی کروں؟ آخر آپ کی اور اس ملک کے دوسرے متعدد علماء کی رائے سے بھی تو میں اختلاف کر کے اپنی تحقیق پیش کر ہی رہا ہوں۔ آپ میری دلیل دیکھیے، نہ یہ کہ ٹرکی اور حجاز میں اس کے خلاف کیا عمل ہوتا رہا۔

میں جانتا ہوں کہ میرے سارے استدلال کو یہ کہہ کر رد کیا جاسکتا ہے کہ بہر حال یہ قرآن و حدیث سے براہِ راست استنباط ہے اور اس میں یہ پرواہ نہیں کی گئی ہے کہ یہ استنباط فقہائے امت کے موافق ہے یا مخالف۔ لیکن اگر یہ کسی معقول اور صحیح استدلال کو رد کر دینے کے لیے شرعاً کافی وجہ ہو سکتی ہے تو مجھے اس وجہ کا ماخذ سے مطلع فرمایا جائے ورنہ مجھے معاف فرمایا جائے اگر میں عرض کروں کہ تقلیدِ جامد کی یہی وہ قسم ہے جو علمائے کرام کے طعنوں اور ملامتوں کے باوجود ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔ والسلام۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

مولانا ظفر احمد صاحب کا دُوسرا مکتوب

مکرمی! مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی دام فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ محبت نامہ میرے خط کے جواب میں موصول ہوا بہت مسرت ہوئی اور دل سے دعائیں نکلیں۔ میں خوش ہوں کہ میری خیر خواہانہ تحریر پر آپ نے خلوص و محبت کی نظر ڈالی اور تفصیل کے ساتھ جواب لکھنے کی زحمت برداشت کی

مجھے آپ سے ایسی ہی توقع تھی۔ اب میں اختصار کے ساتھ چند باتیں اس خط کے متعلق اور عرض کرتا ہوں۔ امید ہے اُن کو بھی خیر خواہی پر محمول فرما کر نظرِ خلوص سے دیکھا جائیگا۔

آپ نے کتبِ[1] تفسیر کے متعلق فرمایا ہے کہ "میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو بھی حرفِ آخر نہیں سمجھتا" تو ٹھیک اسی طرح اپنی کسی تحقیق کو بھی حرفِ آخر نہ سمجھنا چاہیے بلکہ ایسے مواقع پر صاف لکھ دینا چاہیے کہ عام مفسرین کے بیانات سے میرا اطمینان نہیں ہوا اس لیے غور و فکر کے بعد جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے، دوسرے علماء سے بھی تحقیق کر لی جائے۔ اور میری تحقیق کو فتویٰ نہ سمجھا جائے کیونکہ مجھے منصبِ افتا حاصل نہیں ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے "نیز میرا تجربہ ہے کہ مذاہب اربعہ کے اقوال کو الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں کافی احتیاط کے ساتھ ثبت کیا گیا ہے" الخ لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ محض کتابیں دیکھ لینے سے دوسرے مذاہب سے پوری واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اُن مذاہب کے علماء سے اُسی طرح اُن کا فقہ نہ پڑھا جائے جس طرح ہم نے فقہ حنفی کو اپنے علماء سے پڑھا ہے۔ کیونکہ فقہی کتابوں میں بالعموم اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذاہب کے اقوال نقل کرنے والے بھی اُن کی کتابوں کو دیکھ کر ہی نقل کرتے تھے مگر پھر بھی اُن سے بہت کچھ خطائیں ہوئی ہیں جس کا سبب بظاہر یہی ہے کہ انہوں نے باقاعدہ ان کے مذاہب کو نہ پڑھا تھا۔ پھر ہم اور آپ کس شمار میں ہیں کہ صرف مطالعہ کتب سے اُن مذاہب کو حاصل کر سکیں۔

میرا تجربہ ہے کہ المغنی لابن قدامہ میں بہت سے مسائل مذہب احمد کی طرف منسوب کیے گئے ہیں حالانکہ علماء حنابلہ کا فتویٰ اُس کے خلاف ہے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ آپ کوچۂ تصوف سے نابلد نہیں ہیں اور آپ نے تصوف کو بھی دیکھا ہے اور اہلِ تصوف کو بھی۔ مگر بہر حال الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ جس درجہ کی طرف اشارہ ہے اُس کی تحصیل ضروری ہے۔ اس کی ضرورت سے

[1] یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ بیان القرآن آپ کے پاس نہیں۔ شاید اردو میں ہونے کی وجہ سے اُسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا مگر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بہت سی
[illegible]

آپ انکار نہیں کر سکتے اور یقیناً جب تک قرآن وحدیث دنیا میں موجود ہے دنیا محسنین سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اُن کی تلاش ضروری ہے۔ نہ معلوم آپ کے نزدیک معیار کمال کیا ہے؟ صوفیہ کا اصلی کمال یہی نسبت احسان ہے۔ اسی کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے اذا رأوا ذکر اللہ۔ اور یقیناً ایسے لوگ اب بھی ہیں ———— مگر اُن کے پاس خالی الذہن ہو کر جانا چاہیے ناقد بن کر نہ جانا چاہیے کہ ناقدانہ نظر سے تو رسول کے کمالات بھی مخفی ہو جاتے ہیں ولی کس شمار میں ہے؟

دارالاسلام کی مسلمان رعایا اور دارالکفر کی مسلم رعایا کے باہمی تعلقات کے معاملہ میں شرح السیر الکبیر للامام محمد بن الحسن الشیبانی کا مطالعہ ضروری ہے وہ ان شاء اللہ اس باب میں شافی کافی ہے۔ آپ نے جو سیاسی اور بین الاقوامی الجھنیں اہل دارین کے توارث و تناکح میں بیان فرمائی ہیں وہ تو دارالکفر کے مسلمانوں کی ہجرت میں بھی موجود ہیں تو کیا ہجرت کو بھی اس خیال سے بند کر دیا جائے گا کہ مبادا یہ لوگ جاسوس بن کر آتے ہوں۔ بالخصوص ہندو رعایائے پاکستان کی واپسی ہندوستان سے تو بالکل بند کر دینی چاہیے کہ اُن پر تو سو فیصدی جاسوسی کا شبہ ہے۔ بلکہ پاکستان سے باقیماندہ ہندؤں کو بھی نکال دینا چاہیے کہ ان پر مارِ آستین ہونے کا شبہ ہے۔ نیز پاکستان کے تاجروں کا ہندوستان مال لے کر جانا بھی روک دیا جائے۔ اسی طرح وہاں کے تاجروں کا پاکستان آنا بھی۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہو سکتا ہے، پھر توارث و تناکح ہی میں یہ احتمالات مانع کیوں بن گئے؟ ان پیچیدگیوں کا جو علاج قرآن نے بتلایا ہے یا ایھا الذین آمنوا اذا جاءکم المومنات مھاجرات فامتحنوھن وہی سب صورتوں میں بروئے کار لایا جائے گا۔ حکومت کو اُن لوگوں پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیے جو پاکستان سے باہر جاتے آتے یا ہندوستان سے نکاح و وراثت کا تعلق رکھتے ہیں مگر نفس تناکح و توارث کو ان احتمالات کی بنا پر ممنوع نہیں کر سکتے جبکہ ہجرت اور

یہ ظاہر ہے نسبت صوفیہ حقیقت ہے مگر اس کا دار و مدار علامات حدیث پر ہے

تجارت کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ تجارت کا دروازہ کھولنے سے پاکستان کا وہ مال بھی پاکستان سے باہر جا رہا ہے جس کو حکومت پاکستان برآمد نہیں کرنا چاہتی اور مسلم مہاجرین اور ہندو مراجعین میں بعض پاکستان آکر جاسوسی بھی کرتے ہیں۔

آیت والذین امنوا ولم یہاجروا ما لکم من ولایتہم من شیئٍ حتی یہاجروا۔ یہ اُس وقت کا حکم ہے جبکہ ہجرت فرض اور شرطِ قبولِ اسلام تھی۔ حدیث انا بریءٌ من کل مسلم بین ظہرانی المشرکین بھی اُسی وقت کے متعلق ہے۔ اور اُس وقت حکومتِ مدینہ مہاجرین کی آبادکاری کی ذمہ دار تھی۔ مگر آپ کی حکومت تو اس کی ذمہ داری نہیں لیتی بلکہ مہاجرین کی آمد کو روکنا چاہتی ہے۔ اور جو پاکستان آگئے ہیں اُن کو بھی ہندوستان واپس کرنا چاہتی ہے۔ اور جو ہندو یہاں سے چلے گئے ہیں ان کو واپس بلانا چاہتی ہے۔ اس حالت میں جو مسلمان دارالکفر کی رعایا بنے ہوئے ہیں مجبور ہیں اُن پر اس آیت کے احکام چسپاں کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اس لیے جب تک ہندوستان کے مسلمانوں پر ہجرت کو فرض نہ کیا جائے اور جب تک حکومت پاکستان ان چار کروڑ مسلمانوں کی آبادکاری کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے اس وقت اُن تمام احکام کو ثابت نہیں کیا جا سکتا جو آپ اس آیت سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

جن مفسرین نے اس سے مسلمین دارالاسلام و دارالکفر کے مابین قطعِ توارث سمجھا ہے اور آیت کو وراثت کے معنی میں لیا ہے وہی اس آیت کو سورۂ احزاب کی آیت واولوا الارحام بعضہم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ من المومنین والمہاجرین سے منسوخ مانتے ہیں۔ چونکہ آپ نے بھی اس سے قطعِ توارث پر استدلال کیا ہے اس لیے میں نے کہا تھا کہ پھر اُن مفسرین کی طرح اس حکم کو سورۂ احزاب کی آیت سے منسوخ بھی ماننا چاہیے۔ یہ تعارض میں نے پیدا نہیں کیا بلکہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے۔

آپ تو دارالکفر کے مسلمانوں کو دارالاسلام میں حقوقِ شہریت اور ذمہ داری کے

عہدے دینے سے انکار کرتے ہیں مگر حکومتِ پاکستان دارالکفر کے کفار کو پاکستان میں حقوقِ شہریت اور ذمہ داری کے عہدے دے رہی ہے۔ غالباً ابھی تک بہت سے انگریز بڑے بڑے عہدوں پر ہیں اور بہت سے ماہرین کو امریکہ ولندن وغیرہ سے بلایا جا رہا ہے۔ اور غالباً آپ بھی اس کو شرعاً ممنوع نہ کہیں گے ورنہ پاکستان ترقی نہ کر سکے گا۔ پھر مسلم غیر مہاجر ہی کیوں خطاوار ہے؟

دارالکفر اور دارالاسلام کے مسلمانوں میں کفاءت کی نفی کرنا نرالی تحقیق ہے۔ کیا ایک سید ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے سید نہ رہے گا جولاہا بن جائے گا؟ آخر قطع ولایت سے (اگر تسلیم بھی کر لی جائے) نفی کفاءت کیونکر لازم آگئی؟

جو عورت مہاجرہ ہو کر دارالاسلام میں آجائے اور شوہر دارالکفر میں رہنے پر مصر ہو اس کے لیے اول شوہر سے طلاق حاصل کرنے کا حکم ہے۔ اگر وہ طلاق نہ دے تو حاکم مرافعہ کے بعد طلاق واقع کر سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو آیت مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے لیے دوسرے دلائل ہیں جن سے فقہاء نے تعرض کیا ہے۔ ملاحظہ ہو الحیلۃ الناجزہ حکیم الامۃ التھانویؒ۔

آیت ولا تمسکوا بعصم الکوافر استدلال کے لیے نہیں بلکہ آپ کے الزام دینے کے لیے لکھی تھی کہ آپ تو آیت والذین آمنوا ولم یہاجروا ما لکم من ولایتھم من شیءٍ سے باہم مسلمانوں کے درمیان قطع ولایت کے قائل ہو رہے ہیں حالانکہ آیت ولا تمسکوا بعصم الکوافر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم مہاجر [illegible] درجہ کافر و غیر مہاجرہ کے درمیان بھی قطع ولایت اس سے پہلے نہ ہوئی تھی، کیونکہ نکاح بھی ولایت کے مفہوم میں داخل ہے۔ رہا یہ دعویٰ کہ اس آیت کے نزول تک مشرکین و مشرکات کے ساتھ مناکحت کی حرمت کا حکم نہ آیا تھا الخ، محتاجِ دلیل ہے۔ آیت ولا تنکحوا المشرکات حتی یؤمن .... ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا (سورۂ بقرہ) اس سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت سے ابتداءً نکاح ما بین مسلم و کافرہ وبرعکس حرام ہو گیا۔ نکاح سابق کا انقطاع نہ ہوا تھا۔ وہ سورۂ ممتحنہ کی آیت سے ہوا۔ سو یہ میرے مدعا کے لیے مؤید ہے کہ مسلم مہاجر اور کافرہ غیر مہاجرہ کے درمیان اس وقت تک ولایت باقی تھی تو آپ مسلم و مسلمہ کے درمیان قطع ولایت کے کیسے قائل ہیں؟

مَیں پھر عرض کرتا ہوں کہ قرآن و حدیث سے براہِ راست استنباط کو میں منع نہیں کرتا، مگر اس کے لیے جس قدر وسعت نظر فی الحدیث اور معرفت ناسخ و منسوخ و معرفت اقوالِ فقہاءِ سابقین کی ضرورت ہے یہ شرط ہم میں اور آپ میں مفقود ہے اس لیے یقیناً ہم سے بڑی بڑی خطاؤں کا ارتکاب ہوگا۔ سلامتی اسی میں ہے کہ جب کسی مسئلہ میں فقہاءِ سابقین کا فیصلہ نہ ملے علماءِ وقت سے مراجعت کی جائے۔ شاید کسی کو کچھ مل جائے۔ یا کم از کم اپنی تحقیق کو حرفِ آخر نہ سمجھا جائے اور صاف لکھ دیا جائے کہ اس مسئلہ میں فقہاءِ سلف کے کلام میں کوئی جزئیہ نہیں ملا۔ مَیں نے قرآن و حدیث سے یہ سمجھا ہے دوسرے علماء سے بھی تحقیق کر لی جائے اور میری تحقیق کو فتویٰ نہ سمجھا جائے۔ والسلام۔

ظفر احمد عثمانی

جواب

محترمی و مکرمی جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ باعث سرفرازی ہوا۔

میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ مَیں نے کبھی اپنی کسی تحقیق کو، دوسروں ہی کے لیے نہیں خود اپنے لیے بھی، حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ میری ہر رائے قابلِ نظرِ ثانی ہے۔ جب کبھی مجھ پر خود مزید مطالعہ

تحقیق سے اپنی کوئی غلطی واضح ہو جاتی ہے، اس کی اصلاح کر لیتا ہوں اور اس کا اظہار بھی کر دیتا ہوں۔ اور جب کبھی کسی کی تنقید سے، خواہ وہ کتنی ہی مخالفانہ و معاندانہ ہو، بدلائل میری کوئی غلطی مجھ پر ظاہر ہو جاتی ہے، اس سے رجوع کرنے میں مجھے تامل نہیں ہوتا۔ اس بات کا بھی بارہا اظہار کر چکا ہوں کہ فقہی مسائل میں اپنی تحقیق سے جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے وہ کوئی فتویٰ نہیں ہے بلکہ ایک اظہار رائے ہے تاکہ اہل علم اس پر غور کریں، اگر میری تحقیق سے مطمئن ہوں تو قبول کریں، ورنہ دلیل سے اس کو رد کر دیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر علمی بحث یا ہر اظہار رائے کے ساتھ اس بات کی تصریح کر دینا مشکل ہے۔

مولانا تھانویؒ کی بیان القرآن سے میں نے کبھی کبھی استفادہ کیا ہے۔ پٹھان کوٹ کے قیام کے زمانہ میں وہ ہمارے کتب خانہ میں موجود تھی۔ مگر ہمارا جو ذخیرہ وہاں رہ گیا اس میں جہاں اور بہت سی کتابیں ضائع ہوئیں وہاں ایک یہ کتاب بھی تھی۔ اب رفتہ رفتہ اس نقصان کی تلافی کی جا رہی ہے اور از سر نو کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ مجھے علم کے معاملہ میں کوئی تعصب نہیں ہے۔ متقدمین کی طرح معاصرین سے بھی استفادہ کرتا ہوں اور عربی کی طرح اردو میں بھی کہیں علم موجود ہو تو اس سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔

مجھے آپ کی اس رائے سے جزوی اتفاق ہے کہ دوسرے مذاہب کی پوری واقفیت ان کے علماء سے پڑھے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے اس جز سے اتفاق نہیں ہے کہ اس طرح کی "پوری واقفیت" کے بغیر سرے سے بحث و تحقیق ہی بند ہو جانی چاہیے۔ اگر یہ بات درست ہو تو آخر ہمارے مدارس دینیہ میں درس حدیث و فقہ کے موقع پر مذہب حنفی کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتے ہوئے جو بحثیں کی جاتی ہیں ان میں کیا وزن باقی رہ جاتا ہے؟ نیز اسلام اور دوسرے ادیان یا اسلامی قانون اور دوسرے قوانین کے تقابل پر ہم جو کچھ لکھتے اور بولتے رہتے ہیں اس کے لیے بھی کیا وجہ جواز باقی رہتی ہے جبکہ ہم نے ان کی کتابوں کو استادوں سے سبقاً سبقاً نہیں پڑھا ہے؟ میرے خیال میں صحیح یہ ہے کہ جتنی کچھ بھی تحقیق کتابوں کے ذریعہ سے ممکن ہو کرنی چاہیے

اور اصلاح کے لیے تنقید پر اعتماد کرنا چاہیے۔ آخر ہم مغربی علوم و فنون اور قوانین کے بارے میں بھی تو اُن کی کتابوں ہی کو پڑھ کر کلام کرتے ہیں۔ ہر چیز کو سبقاً سبقاً تو نہیں پڑھتے۔ ہماری تحریریں ہر طرح کے اہل علم تک پہنچتی ہیں اور جس معاملہ میں بھی کوئی غلطی ہوتی ہے کوئی نہ کوئی باخبر آدمی اس پر ٹوک دیتا ہے۔ اس طرح تمام علمی مسائل میں حقائق کی تنقیح اور غلطیوں کی اصلاح ہوتی رہتی ہے اور علمی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ صرف ایک فقہ ہی کیوں ایسی چھوئی موئی ہو کہ اس میں بحث و تحقیق کا کام صرف اس اندیشے سے بند رکھا جائے کہ کہیں کسی مذہب فقہی کے بیان میں ہم سے غلطی سرزد نہ ہو جائے؟ اور اس طرح کی احتیاط اگر متقدمین نے برتی ہوتی تو ہم تک ان کی وہ بیش قیمت تحقیقات کیسے پہنچتیں جن میں بیشمار مفید چیزوں کے ساتھ ساتھ آپ کے اپنے بیان کے مطابق غلطیاں بھی ہیں؟ بحث و تحقیق میں احتیاط تو ضروری ہے مگر نہ اتنی احتیاط کہ یا تو سرے سے بحث و تحقیق ہی بند کر دی جائے یا اس کے لیے ایسی شرطیں لگا دی جائیں جو پوری نہ ہو سکتی ہوں۔

درجۂ احسان کی اہمیت اور اس کے حاصل کرنے کی ضرورت سے انکار کا کیا موقع ہے۔ میرے نزدیک تو یہی اصل میں مطلوب ہے۔ اور میں اس سے بھی انکار نہیں کرتا کہ محسنین سے خدا کی زمین نہ پہلے خالی تھی نہ اب خالی ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی ہیں خدا کی رحمت کا ایک نشان ہیں اور ان کی صحبت، معیت، رفاقت ہمارے لیے سرمایۂ سعادت ہے۔ مگر طول بحث سے بچتے ہوئے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ جہاں بالعموم ان لوگوں کے زیادہ پائے جانے کا گمان کیا جاتا ہے وہاں یہ سب سے کم پائے جاتے ہیں، اور جن گوشوں کو "اہل فن" اتنا حقیر سمجھتے ہیں کہ احسان کی کوئی جھلک تک ان میں دیکھنے کی توقع نہیں رکھتے، وہیں یہ اکثر مل جاتے ہیں۔ اہل فن میں جن شخصیتوں کو مزکّٰی اور مُزکّی ہونے کی شہرت حاصل ہے ان میں جن جن کے ساتھ مجھے کسی نہ کسی طور پر سابقہ پیش آیا ہے اور میں نے اُن کے اندر وہ وہ کمزوریاں پائی ہیں جو معمولی انسانوں کے لیے بھی موزوں نہیں ہیں کجا کہ ماہرینِ تزکیۂ نفس کے لیے۔ اس کے برعکس غیر معروف لوگ جو دنیا کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اور جنہیں شاید کوئی مرتبہ بھی اہل فن کے ہاں نہیں مل سکتا ان کے اندر ایسے ایسے بندۂ حق ملے ہیں جو خوفِ خدا سے کانپنے والے

اور اس کی رضا جوئی کے لیے ہر فائدے کو قربان اور ہر نقصان کو گوارا کرنے والے ہیں اور جنہیں قبولِ حق اور ادائے حق سے نہ کوئی نفسانیت باز رکھ سکتی ہے اور نہ کوئی عصبیت۔

شرح السیر الکبیر بلاشبہ اسلام کے بین الاقوامی قانون پر ایک بہترین کتاب ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے علاوہ مبسوط اور دوسری کتابوں کے بھی وہ ابواب پڑھے ہیں جو بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دارالکفر اور دارالاسلام کے تعلقات پر تو بہت اچھی روشنی ڈالی گئی ہے، مگر افسوس ہے کہ دارالکفر کی مسلم رعایا اور دارالاسلام کے تعلقات کا پہلو اُن سب میں بہت تشنہ ہے۔ میں آپ سے پھر گذارش کروں گا کہ اس خاص پہلو پر متقدمین کی کتابوں میں جو بحثیں ہیں آپ ایک مرتبہ پھر اُن کا جائزہ لے کر دیکھیں اور اِس وقت کے حالات پر ان کو منطبق کرنے کی کوشش فرمائیں، مجھے توقع ہے کہ اس کے بعد آپ کو خود بھی ان کی تشنگی کا احساس ہو جائے گا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جو دَور ہمارے ہاں فقہی اجتہاد کے لیے ممتاز رہا ہے اُس میں سارے مسلمان دارالاسلام ہی کی رعایا تھے اور کم ہی ایسا اتفاق ہُوا تھا کہ کوئی بڑی مسلم آبادی کفار کی رعیت بنی ہو۔ بعد میں جب بڑی بڑی مسلم آبادیاں کفار کی رعیت بن گئیں تو اس وقت اجتہاد کا دروازہ قریب قریب بند ہو چکا تھا۔ اس لیے ہمارے قانون کا یہ شعبہ بڑی حد تک تشنۂ تفصیل رہ گیا۔ پھر موجودہ زمانہ کی ہمہ گیر قومی ریاست سے تو مسلمانوں کو پہلے کبھی سابقہ پیش ہی نہیں آیا تھا جس میں ریاست کی پوری آبادی کو "ایک قوم" فرض کر کے کافر اکثریت مسلمانوں پر اپنی تہذیب و تمدن اور قوانینِ حیات ہی کو نہیں بلکہ اپنے نظریات و تخیلات اور احساسات تک کو مسلط کر دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس طرح کی غیر مسلم قومی ریاست کا معاملہ تو اُس دارالکفر کے معاملہ سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے جہاں مسلمانوں کو ایک "ذمّی قوم" کی سی پوزیشن دی گئی ہو، اور یہ معاملہ اُس سے زیادہ گہری نظر چاہتا ہے جس سے آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔

اس معاملہ میں اصل تصفیہ طلب چیز یہ نہیں ہے کہ جاسوسی کے امکانات کہاں کہاں ہیں اور ان کو کس طرح بند کرنا چاہیے، بلکہ یہ ہے کہ وہ "ولایت" جس کو دارالاسلام کی حکومت اور مسلم رعایا اور

دارالکفر کی مسلم رعایا کے باہمی تعلقات سے ساقط کیا گیا ہے، کن معنوں میں ہے اور اس کے حدود کیا ہیں، اور اس کے سقوط کے عملی اثرات و نتائج کیا ہیں۔ یہ اس کے جو معنی اور حدود بیان کر رہا ہوں اگر آپ کو اس سے اتفاق نہیں ہے تو آپ خود بیان فرمائیں کہ آپ اس کا کیا مطلب سمجھتے ہیں۔

آپ کا یہ معارضہ البتہ وزنی ہے کہ جب دارالاسلام نے اپنے دروازے مہاجرت کے لیے بند کر رکھے ہوں تو وہ احکام موجودہ حالات پر کیسے منطبق ہونگے جو ہجرت کی فرضیت کے زمانے میں دیے گئے تھے۔ مگر میری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احکام تو بلاشبہ ہجرت کی فرضیت کے زمانے میں دیے گئے تھے، لیکن "سقوطِ ولایت" ہجرت کی فرضیت پر موقوف نہیں ہے بلکہ مجرد اختلافِ دارین اس کا مبنیٰ ہے۔ اگر آپ میری اس بات کو نہیں مانتے تو کیا آپ یہ فرماتے ہیں کہ جب دارالاسلام کی حکومت تمام کافر حکومتوں کی مسلم رعایا کو ہجرت کی دعوت نہ دے سکتی ہو تو اس صورت میں وہ اُن کی پوری مسلم رعایا کی ولی ہے؟ اور کیا اس صورت میں دارالاسلام کے مسلمان بھی دارالکفر کے مسلمانوں کے ولی ہوں گے؟ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے۔ جو دارالاسلام اتنا کمزور ہو کہ اپنے قریب ترین دارالکفر کی مسلم آبادی کو بھی پناہ نہ دے سکتا ہو وہ اس کی ولایت کا حق ادا کرنے سے بدرجۂ اولیٰ قاصر ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ جو حقائق اور مصالح اس ولایت کے سقوط کے مقتضی ہیں ان کا کوئی تعلق بھی ہجرت کے وجوب و عدمِ وجوب سے نہیں ہے۔ اُن کی بنیاد تو دراصل یہ ہے کہ جو مسلمان ایک غیر مسلم حکومت کے تابع امر ہیں اُن کی ولایت کا بار سنبھالنا مسلم حکومت کے لیے عملاً غیر ممکن ہے، اور مزید برآں اگر مسلم حکومت اُن کی ولی بننے کی مدعی ہو، اور اس ولایت کا حق ادا کرنے کے لیے ہمسایہ غیر مسلم حکومتوں کے دائرۂ اقتدار میں مداخلت کرے، یا کم از کم نظری حیثیت ہی سے اپنے لیے اس مداخلت کا حق محفوظ رکھے، تو یہ چیز اس کو اُن تمام غیر مسلم حکومتوں سے ایک دائمی آویزش میں مبتلا کر دے گی جن کے تحت مسلمان آباد ہوں۔

آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ ولایت کے اسقاط کا یہ حکم دارالکفر کے مسلمانوں کو محض ہجرت نہ کرنے کی سزا دینے کے لیے تھا۔ اس لیے آپ کو یہ اعتراض ہے کہ جب ہم اُن پر ہجرت کا راستہ

نہیں کھول رہے ہیں تو اُن کو یہ سزا کیوں دی جائے۔ مگر جو بات میں نے اوپر عرض کی ہے اس پر اگر آپ غور فرمائیں گے تو مجھے امید ہے کہ آپ کا یہ اعتراض دور ہو جائے گا۔ وجوبِ ہجرت کی صورت میں ہجرت نہ کرنے کی سزائیں دوسری ہیں جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان کی گئی ہیں۔ ان سزاؤں کو (جو صرف وجوبِ ہجرت کی صورت کے لیے مخصوص ہیں) بین الاقوامی قانون کی مستقل دفعات کے ساتھ (جن کا مبنیٰ مجرد اختلافِ دار ہے خواہ ہجرت ممکن اور واجب ہو یا نہ ہو) خلط ملط کر دینے سے بڑی غلط فہمیاں لاحق ہو سکتی ہیں۔

بیرونی ممالک سے ماہرین کی خدمات حاصل کرنا اور چیز ہے اور کسی کو حقوقِ شہریت دے کر اُن تمام رازوں اور ذمہ داریوں میں شریک کر لینا جن میں صرف شہری ہی شریک ہو سکتے ہیں، بالکل ہی ایک دوسری چیز۔ ضرورت کے وقت شریعت ہمیں باہر سے ماہرین کی خدمات حاصل کرنے سے نہیں روکتی۔ مگر یہ بات، کم از کم میرے علم میں تو، قرآن کی دی ہوئی ہدایات کے بالکل خلاف ہے کہ جو شخص ایک غیر مسلم حکومت کی رعایا ہو، اور جس کے سارے مفادات دارالکفر سے وابستہ ہوں، اُس کو ہم اپنے ہاں سفیر اور وزیر اور سکرٹری وغیرہ بنائیں۔

قطعِ ولایت سے مطلق کفاءت کی نفی کا دعویٰ میں نے کب کیا تھا کہ اس سے دارالکفر کے کسی سیّد کا غیر سید ہو جانا لازم آئے۔ میرا مدعا تو یہ تھا کہ مناکحت میں جس کفاءت کا اعتبار کیا جاتا ہے وہ صرف انہی لوگوں کے درمیان معتبر ہے جن کے درمیان موالاۃ ہو۔ جہاں سرے سے موالاۃ ہی نہ ہو وہاں کفاءت اگر نسب یا دوسرے وجوہ سے موجود بھی ہو تو وہ شادی بیاہ کے لیے کوئی موزوں بنیاد نہیں ہے۔ اس لیے کہ مناکحت سے زوجین کے جو قانونی حقوق ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں ان کی بنیاد کفاءت پر نہیں بلکہ ولایت پر قائم ہوتی ہے۔ اگر ولایت نہ ہو تو ان حقوق کے استقرار میں کفاءت کچھ بھی مددگار نہیں ہوتی۔ دارالکفر کے ایک سید صاحب دارالاسلام کی ایک سیدانی کے باعتبارِ نسب کفو ہی سہی، مگر یہ کفاءت اس غریب کو مہر، نفقہ، اور دوسرے حقوقِ زوجیت دلوانے میں آخر کیا مدد کر سکتی ہے؟

تاہم، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، میری اس تقریر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں کے درمیان مناکحت حرام ہے، یا ان کے سابق نکاح اختلافِ دارین سے آپ ہی آپ ٹوٹ گئے ہیں، یا آئندہ ان کے درمیان نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جن زوجین کے درمیان اختلاف دار واقع ہو چکا ہے ان کی طرف سے اگر فسخِ نکاح کی درخواست ہماری عدالت میں آئے تو وہ قابلِ لحاظ ہونی چاہیے، اور یہ کہ آئندہ اس طرح کے رشتے کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کے یہ دونوں عنایت نامے اور ان کے جواب فائدۂ عام کے لیے جُوں کے توں شائع کیے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنے پہلے جواب میں کچھ تشریحات کا اضافہ کر دیا ہے جو اصل خط میں نہ تھیں۔ اُن کے متعلق کچھ فرمانا چاہیں تو ترجمان القرآن کی دوسری اشاعت میں آپ کے ارشادات کو جگہ دے دی جائے گی۔ تازہ پرچہ جس میں یہ دونوں خطوط اور جوابات شائع کیے جا رہے ہیں انشاء اللہ جلدی حاضر خدمت ہوگا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

جماعتِ اسلامی اور علماءِ کرام

چند سوالات اور اُن کے جوابات

[ماہ شعبان کے پرچہ میں جو مضمون بعنوان "علماء کرام کی خدمت میں" لکھا گیا تھا اسے دیکھ کر پنجاب کے ایک عالمِ دین کا ایک مکتوب ہمیں وصول ہوا ہے جس میں چند سوالات بھی کیے گئے ہیں۔ ذیل میں وہ مکتوب اور اس کا جواب درج کیا جاتا ہے]

"جماعت اسلامی اور علماء حق کا نزاع اندریں صورت قابلِ افسوس ہے۔ اس سے اصل کام کی رفتار پر بہت بُرا اثر پڑیگا اور یہ معمولی بات نہ سمجھی جائے۔

مذہبی جماعتوں میں سے جماعت اسلامی کو اچھی نگاہ سے دیکھنے والی اور جائز حد تک اتفاق ظاہر کرنے والی ایک اہلِ حدیث کی جماعت ہے (جو قلیل ہے) اور دوسری جماعت علماء حق کی ہے جو اہلِ دیو بند سے متعلق ہے (یعنی بریلویوں کے مقابلے میں) اور یہ کثیر تعداد میں ہے۔ اگر اس گروہ عظیم کے اکابر و اصاغر جماعت اسلامی سے اس رنگ میں متنفر ہوتے ہیں تو بنظر غائر دیکھ لیا جائے کہ عوام میں کتنی بے لطفی پیدا ہو جائے گی۔ اور اصل مقصد سے ہٹ کر جماعت اسلامی کے افراد کس فرقہ بندی کی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔

تا حال ابھی اختلافات کی ابتدا ہے۔ بریلویوں کی طرف سے "خطرہ کی گھنٹی" شائع ہوئی ہے بعض اہلِ دیو بند کی طرف سے دو چار اشتہار شائع کیے گئے ہیں[1]۔ ان کا تدارک ہو

---

[1] افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں آپ کو پوری معلومات نہیں ہیں۔ درحقیقت اب تک کئی فتوے بڑے بڑے علماء کرام کے دستخطوں سے پمفلٹوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ہندوستان و پاکستان میں ان کو کثرت سے پھیلایا جا رہا ہے۔ (نائب مدیر)

سکتا ہے، غلط فہمی کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر تھوڑی دیر جماعت کے اتمام مقاصد کی سیاست کو سامنے نہ بھی رکھا جائے تب بھی سوء ظنی عامۃ المسلمین کی دور کرنی تو ان حالات میں از روئے اسلام ضروری ہے۔

جماعت اسلامی کی طرف سے میری دانست کے موافق شاید کو تر میں ان شکایات کا جائزہ کچھ سرسری طور پر لیا گیا ہے۔ باقی مستقل طور پر ان کے جوابات کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اس میں تاخیر و تاجیل بتقاضائے وقت میرے خیال میں ہرگز درست نہیں۔

موٹے موٹے اعتراضات یا شکایات تقریباً سامنے آچکے ہیں۔ عبارتوں کو قطع و برید کر کے تیار کیے گئے ہیں، یا باستنباط تجویز ہوئے ہیں۔ بہرکیف ان کا نمبروار تسلی بخش جواب جماعت کی طرف سے آجانا چاہیے اگر وہ معاملہ جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔

اور اگر آپ کی ذات سے متعلق ہے تو اس کو آپ ذاتی طور پر بطریق احسن واضح کریں تاکہ ایک سلیم الطبع آدمی کو پھر سوال و جواب کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑے۔

ان ساری تفصیلات تسلی بخش کے بعد پھر بھی ضدی طبائع اگر جوں کے توں سوال جڑتے رہیں تو اس وقت آپ بیشک جواب سے سروکار نہ رکھیں۔ اور اپنے کام میں مصروف رہیں۔ اور جماعت کے تمام افراد کو بھی یہی تلقین ہونی چاہیے کہ اپنے مسلک کی وضاحت کے سوا اعتراض و جواب سے خاموشی اختیار کی جائے۔ اور معاملہ اللہ جل جلالہٗ کے سپرد کیا جائے۔

تقریباً سوالات حسب ذیل ہی پیش آرہے ہیں۔ ان کے جوابات آنجناب خود ہی سپرد قلم فرما دیں:-

اوّل۔ جماعت اسلامی میں جو مسلمان داخل نہیں ان کے اسلام و ایمان کے متعلق کیا رائے ہے؟ اسلام میں داخل اور مسلمان ہیں یا نہیں؟

ثانی۔ کبائر کے مرتکب مسلمانوں کا کیا حکم ہے؟

ثالث۔ سلف صالحین (صحابہؓ، تابعینؒ، اولیاء اللہ، صوفیہؒ، علماء اہل سنت) کے ساتھ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے جو کچھ معتقدات ہیں ان سب کو آپ تسلیم کرتے ہیں یا کہیں کچھ جمہور کے ساتھ اختلاف ہے؟ اگر اختلاف ہے تو ان خلافیات کو بیان فرمایا جائے۔

رابع۔ اپنے مجدد اور مہدی ہونے کے متعلق کیا رائے ہے؟ آئندہ چل کر اگر آپ مجدد یا مہدی ہونے کا دعویٰ کریں وہ صحیح ہوگا یا غلط؟

خامس۔ کیا آپ جمہور علماء سلفؒ کی تحقیقات و اجتہادات پر اپنی تحقیقات کو ترجیح دیتے ہیں یا اس کے برعکس اپنے استنباطات کو ان کے اجتہادات کے مقابلہ میں مرجوح قرار دیتے ہیں؟"

جواب

آپ کا یہ خیال درست ہے کہ موجودہ حالات میں جماعت اسلامی اور علماء کرام کی آویزش اسلامی مقاصد کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اس وجہ سے مجھے بھی اس کا بڑا رنج ہے۔ مگر میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ اس میں میری یا جماعت کے کارکنوں کی یا پوری جماعت کی کیا ذمہ داری ہے۔ ہماری مطبوعات دیکھ لیجیے۔ ہماری تقریروں کے متعلق عام سامعین سے پوچھ لیجیے۔ ہماری سرگرمیوں کا جائزہ لے کر تلاش کیجیے۔ کیا کہیں کوئی ایسی چیز ملتی ہے جو علماء کے کسی گروہ کے لیے بھی بجا طور پر موجب اشتعال کہی جا سکتی ہو؟ اگر کبھی ہم نے کسی سے اختلاف کیا بھی ہے تو علمی حیثیت سے کیا ہے۔ دلائل کے ساتھ کیا ہے، دین کی خاطر کیا ہے، احترام اور ادب کو ملحوظ رکھ کر کیا ہے، اور بات کو اسی حد تک محدود رکھا ہے جس حد تک کسی مسئلے میں ہمیں کسی سے اختلاف تھا۔ کوئی شخص ہماری کسی ایسی تحریر یا تقریر کی نشاندہی نہیں کر سکتا جو اس سے مختلف نوعیت کی ہو۔

اہلِ حدیث ہوں یا دیوبندی یا بریلوی، ہم نے ان میں سے کسی گروہ پر، یا اس کے عقائد اور مسلک پر، یا اس کے بزرگوں پر کبھی کوئی حملہ نہیں کیا۔ اور نہ فی الواقع ہمارے دل میں کبھی کسی حملے کا خیال ہی آیا۔ پھر دین کی جو تعبیر و تفسیر ہم آج تک پیش کرتے رہے ہیں، اور جس چیز کی ہم نے دنیا کو دعوت دی ہے، اس میں بھی یہ حضرات درحقیقت کوئی خامی نہیں دکھا سکے اور نہ کسی ایسی چیز کی نشان دہی کر سکے جو حقیقت میں ضلالت ہو۔ اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ یہ آویزش یک طرفہ ہے یا دو طرفہ اور اس کی کوئی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے؟

افسوس کہ ان حضرات کو حالات کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ انہیں کچھ احساس نہیں کہ اس وقت اہلِ دین کی باہمی مخالفت دین کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے اور اس سے عہدِ حاضر کی ضلالتوں کو کتنا بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ انہوں نے اپنے گروہی تعصبات سے خالی الذہن ہو کر ایک لمحہ کے لیے بھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ جماعت اسلامی اس وقت دین کی کیا خدمت کر رہی ہے اور اس مرحلے پر اس کے گر جانے سے دینی محاذ میں کتنا بڑا شگاف پڑ جائے گا جسے پُر کرنے والا کوئی دوسرا منظم اور مستعد گروہ موجود نہیں ہے۔ انہیں یا تو اس بات کی خبر نہیں ہے، یا اس کی پروا نہیں ہے کہ اگر جماعت اسلامی خدانخواستہ ناکام ہو گئی تو پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں مسلمانوں کی نئی روشنی سے متاثر نسلوں کو الحاد و اباحیت کی تحریکوں سے بچانے والی کوئی منظم طاقت موجود نہ رہے گی اور علماء کرام اپنے بل بوتے پر یہ خدمت انجام نہ دے سکیں گے۔ انہیں اس امر کا بھی یا تو شعور نہیں ہے یا ہے تو اس کی کوئی قدر ان کی نگاہ میں نہیں ہے کہ پاکستان کو ایک اسلامی مملکت میں تبدیل کرنے اور یہاں اقتدار کی مسند پر بے دینی کی جگہ دین کو لانے کے لیے جماعت اسلامی کی کوششیں کیا اہمیت رکھتی ہیں اور ان کے ناکام ہونے کی صورت میں یہاں "اشتراکیت یا لامذہبی" کو مسلط ہو جانے سے روک دینا تنہا علماء کرام کے بس کا کام نہیں ہے۔ ان حضرات نے اس حقیقت کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لی ہیں کہ ایک زمانۂ دراز کے بعد اس برعظیم میں بڑی سرگرمی و جانفشانی کے بعد ایک ایسی تحریک اُٹھی ہے جو دین کے بعض اجزاء کو نہیں بلکہ پورے دین کو پورے نظامِ زندگی

پر غالب کرنا چاہتی ہے اور ایک ایسی جماعت منظم ہوئی ہے جس نے جدید و قدیم دونوں طرز کے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس مقصدِ عظیم کے لیے متحد، منظم اور متحرک کیا ہے۔ افسوس اور صد افسوس کہ ایسی ایک تحریک اور ایسی ایک جماعت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے سے انہیں ان کے گروہی تعصبات روک رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی ٹھنڈے دل سے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ کفر و فسق و ضلالت کے اس طوفان میں اس تحریک کا ساتھ دینے کے بجائے اس کو مٹانے کی کوشش کرنا دنیا اور آخرت میں ایک سخت وبال اپنے سر لینا ہے۔

یہ حضرات بار بار اپنی تحریروں اور تقریروں اور اپنے فتووں میں اس بات پر زور دے رہے ہیں، اور عملاً بھی اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ لوگوں کو جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھنے سے روکا جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے اس لٹریچر کو پڑھا بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال ان کی یہ کوشش دانستہ ہو یا نادانستہ، فی الواقع ایک سخت دشمنی ہے جو یہ حضرات اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں اور خود اپنے زیر اثر مذہبی گروہوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اگر ان کی کوششوں سے جدید تعلیم یافتہ نسل جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھنے سے رک جائے تو میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے وہ کونسا لٹریچر پیدا یا فراہم کیا ہے جو ان لوگوں کو خود ان کی زبان اور اصطلاحوں میں دین سمجھا سکتا ہو اور انہیں دورِ جدید کی ضلالتوں سے بچا سکتا ہو؟ اور اگر ان کی کوششوں سے مذہبی طبقے اور خصوصاً عربی مدارس کے طلبہ اور فارغ التحصیل حضرات اس لٹریچر کے مطالعہ سے رک جائیں تو مجھے بتایا جائے کہ یہاں اور کونسا لٹریچر ایسا موجود ہے جو ان لوگوں کو ٹھیٹھ اسلامی نقطۂ نظر سے دورِ حاضر کے مسائل سمجھاتا ہو اور انہیں اس قابل بناتا ہو کہ وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے آنکھ ملا کر بات کر سکیں؟ اس پہلو سے اگر آپ معاملہ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہو کہ ہمارے لٹریچر کی جو مخالفت ان حضرات کی طرف سے کی جا رہی ہے یہ کیسی سخت ناعاقبت اندیشی ہے اور اس کے نتائج کس قدر بُرے ہیں۔

پھر ذرا اس کا بھی اندازہ کیجیے کہ ان حضرات کی مخالفت کے باوجود جو لوگ اس لٹریچر کو پڑھیں گے ان کی نگاہ میں نہ صرف ان حضرات کی، بلکہ پورے گروہ علماء کی وقعت کو کیسا سخت صدمہ پہنچے گا اور

وہ علمبرداران علم دین کی دیانت کو کس قدر مشتبہ سمجھنے لگیں گے۔ ہماری آج تک یہ کوشش رہی ہے اور اب بھی ہم اس کے لیے کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کو علم دین کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلائیں، اور یہ بات ان کے ذہن نشین کریں کہ ان کی زندگی کا نظام کبھی درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی باگیں دین کی واقفیت رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ میں نہ ہوں۔ لیکن آپ مجھے بتلائیے کہ جب عوام اور جدید تعلیم یافتہ لوگ ایک طرف ہمارے لٹریچر کو دیکھیں گے اور دوسری طرف یہ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے نامور علماء نے اس چیز کی کس کس طرح مخالفت کی ہے تو ہماری کوششیں ان کے اندر علماء کے لیے حسن ظن پیدا کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکیں گی۔

آپ چونکہ خود علماء کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے میں یہ باتیں آپ سے اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آپ انہیں ان حضرات تک پہنچائیں جو خواہ مخواہ ہماری مخالفت کر رہے ہیں اور جس حد تک بھی آپ کے بس میں ہو انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔

اب میں ان سوالات کی طرف توجہ کرتا ہوں جو آپ نے اپنے عنایت نامہ میں تحریر فرمائے ہیں:

(۱) پہلے سوال کے متعلق اولین بات جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ آخر یہ سوال پیدا کیسے ہوا؟ کیا ہم نے کبھی یہ کہا یا لکھا تھا کہ جو شخص جماعت اسلامی میں داخل نہیں ہے وہ مسلمان نہیں ہے؟ اگر میری یا جماعت اسلامی کے کارکنوں کی طرف سے کبھی ایسی کوئی بات کہی یا لکھی گئی ہے تو اس کا حوالہ کیوں نہیں پیش کیا جاتا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کے پیدا ہونے میں ہماری کسی غلطی کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ صرف ہمارے مخالفین کے "حسن نیت" کی آفریدہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو کسی طرح ہمارے خلاف بھڑکایا جائے اور بھڑکانے کے لیے اس سے زیادہ کارگر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں سے یہ کہا جائے کہ یہ لوگ تمہیں مسلمان نہیں سمجھتے۔ یہ نسخہ اس سے پہلے بھی اصلاح کی کوشش کرنے والوں کے خلاف بارہا استعمال کیا جا چکا ہے، اور آج یہ ہمارے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے۔

لیکن میں صرف اس منفی جواب ہی پر اکتفا نہ کروں گا۔ میں آج اس سوال کا کوئی نیا جواب

بھی نہ دوں گا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اب اس الزام سے بچنے کے لیے اس کا انکار کیا جا رہا ہے۔ میں اس وقت کی تصریحات پیش کرتا ہوں جبکہ جماعت اسلامی کی تشکیل کی گئی تھی۔ اگر آپ کے پاس ترجمان القرآن کے پرانے فائل موجود ہوں تو براہِ کرم ربیع الاول سنہ ۶۰ھ (مئی سنہ ۴۱ء) کا پرچہ نکال کر دیکھیے۔ اس کے اشارات میں یہ عبارت آپ کو ملے گی:

"جماعت اسلامی کے نام سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس جماعت سے باہر جو لوگ ہیں ان کو ہم غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ ہم نے یہ نام جس وجہ سے اختیار کیا ہے وہ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کے مسلک میں نہ اسلام سے کم کوئی چیز ہو نہ اس سے زائد، جس کا عقیدہ وہی ہو جو اسلام کا ہے، نصب العین وہی ہو جو اسلام نے پیش کیا ہے، نظام جماعت وہی ہو جس کا نقشہ کتاب و سنت میں ملتا ہے، اور کام کا ڈھنگ وہی ہو جو انبیاء نے سکھایا ہے، اس کے لیے آخر "جماعت اسلامی" کے سوا اور کیا نام ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ہرگز یہ فرض نہیں کرتے، اور ایسا فرض کر لینے کا ہم کو حق نہیں ہے کہ ایمان بس اسی جماعت کے اندر منحصر ہے اور اس کے باہر جو لوگ ہیں وہ مومن نہیں ہیں۔ بلکہ اگر کوئی اس جماعت کی مخالفت کرے تب بھی مجرد اس کی مخالفت کی بنا پر ہم اسے غیر مومن نہیں کہہ سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص ہم سے زیادہ صاحب ایمان ہو اور وہ نیک نیتی کے ساتھ کسی غلط فہمی کی بنا پر ہماری مخالفت کرے۔ اپنی حد تک ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ اپنے مسلک اور طریق کار کو عین اسلام کے مطابق رکھیں تاکہ کسی شخص صالح و مومن کے لیے ہم سے علیحدہ رہنے کی کوئی وجہ نہ ہو اور اس طرح تمام اہل ایمان آخر کار ایک ہی نظام میں منسلک ہو سکیں۔ لیکن اپنی اس آرزو کو ایک حاصل شدہ واقعہ فرض کر کے ہم ہرگز فتنہ میں نہ پڑیں گے۔ ہم کو بہرحال مسلمانوں میں ایک فرقہ بننے سے بچنا ہے اور اس غلو سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں جو ہمیں خیر کے بجائے شر کا خادم بنا دے۔"

اس کے بعد جب ہندوستان میں پہلی مرتبہ مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں عام مسلمانوں کی تکفیر کر رہا ہوں اور بعض حضرات نے ازراہِ عنایت مجھے "مکفّرِ ملت" کا خطاب بھی عنایت فرما دیا تو میں نے اپنے ایک مضمون میں پھر اپنی پوزیشن واضح کی۔ یہ مضمون "رفع شبہات" کے عنوان سے ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۵ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ اس کی یہ عبارت قابلِ ملاحظہ ہے:۔

"میرا اصل مدعا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے صالح آدمی چھانٹنا ہے نہ کہ مسلمانوں کے کفر و ایمان کی بحث چھیڑنا۔ مسلمانوں کی موجودہ ایمانی و اخلاقی حالت پر جو تنقیدیں میں نے کی ہیں ان سے بھی میرا مقصد یہ بتانا تھا کہ دعوت الی اللہ کے مقصد عظیم کا اعتبار کرتے ہوئے مسلمانوں میں اس وقت کیا کیا کوتاہیاں پائی جاتی ہیں، اور یہ کہ اس کارِ خطیر کے لیے مسلمانوں کے اس مجموعہ میں سے کس قسم کے لوگ مناسب اور مطلوب ہیں۔ جماعت اسلامی کے دستور میں شہادتین کو شرطِ رکنیت قرار دینے کی غرض بھی صرف یہ ہے کہ جو لوگ اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں ان کے متعلق یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صالح العقیدہ ہیں اور جاہلیت کی اُن آمیزشوں کو لیے ہوئے نہیں آ رہے ہیں جو بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر گھس آئی ہیں، نیز یہ کہ دعوت الی اللہ کی خدمت شروع کرنے سے پہلے وہ ایک مرتبہ پھر اللہ کے ساتھ اپنے عہد و میثاق کو استوار کر لیں اور نومسلمانہ جوش کے ساتھ کام کے لیے آگے بڑھیں۔ میرے اس مقصد کو لوگوں نے نہیں سمجھا اور بعض ہوشیار لوگوں نے قصداً بھی اس کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائیں۔ اس وجہ سے جن بزرگوں کو میری تحریرات کے تفصیلی مطالعہ کا موقع نہیں ملا ہے، اور جن تک میری بات دوسروں کی تحریفات کے واسطہ سے پہنچی ہے انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی کہ میں "مسلمانوں کو ایمان و یقین سے خالی" قرار دے رہا ہوں، اور ان کو "دین کے دائرے سے باہر دھکیل کر پھر اندر آنے کی دعوت" دیتا ہوں، اور یہ کہ "جس توپ خانے کا دہانہ کفر کی طرف کھولا گیا تھا اب اسے اہلِ ایمان کی طرف" کھول رہا ہوں۔ اللہ شاہد ہے کہ میں ان سب باتوں سے بری ہوں۔"

یہ تصریحات اب سے دس برس پہلے کی گئی تھیں اور اس کے بعد سے آج تک بارہا ان کو دُہرایا جا چکا ہے۔ مگر داد دیجیے اُن لوگوں کی دیانت اور جسارت کی جرأت کے باوجود آج تک برابر اپنا یہ الزام دُہرائے چلے جا رہے ہیں کہ یہ شخص مسلمانوں کو نامسلمان قرار دیتا ہے، اور جماعت اسلامی اپنے دائرے سے باہر کسی کے ایمان و اسلام کی قائل ہی نہیں ہے۔ اللہ کے بندے یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہم جو ہر مسجد میں ہر امام کے پیچھے عام مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھتے ہیں، کیا ان سب کو کافر سمجھ کر ہی ایسا کرتے ہیں؟

(۲) آپ کے دوسرے سوال کا جواب بھی آج نئے سرے سے دینے کے بجائے میں اپنا ایک پرانا جواب ہی نقل کرتا ہوں جو اب سے کئی برس پہلے دیا گیا تھا۔ نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء کے ترجمان القرآن میں ایک صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے پہلے یہ بتایا تھا کہ کفر کی دو قسمیں ہیں، ایک کفر باعتبار حقیقت جس کی بنا پر آدمی عنداللہ مومن نہیں رہتا، دوسرا کفر باعتبار ظاہر جس کی بنا پر ایک آدمی کو خارج از ملت قرار دے کر اسلامی سوسائٹی سے کاٹ پھینکنا جائز ہو۔ اس کے بعد پہلی قسم کے متعلق میں نے لکھا تھا:۔

"اس میں شک نہیں کہ معصیت ایمان کی ضد ہے، لیکن مجرد معصیت، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، لازماً ایمان کے مستقل طور پر سلب ہو جانے کی موجب نہیں ہوتی۔ کافر کی طرح مومن سے بھی بڑے سے بڑا گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ البتہ جو چیز مومن کے گناہ اور کافر کے گناہ میں فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے تو عین حالتِ گناہ میں تو ایمان اس سے نکلا ہوا ہوتا ہے، لیکن جب وہ شہواتِ نفس کے اُس غلبے اور نادانی کے اُس پردے سے، جو عارضی طور پر اس کے قلب پر پڑ گیا تھا، باہر نکل آتا ہے تو اس کو شرمساری لاحق ہوتی ہے، خدا سے نادم ہوتا ہے، آخرت کی سزا کا خوف کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ پھر اس سے ایسی حرکت کا ارتکاب نہ ہو۔ اس قسم کی معصیت خواہ کتنی ہی بڑی ہو، آدمی کو کافر نہیں بناتی، صرف گناہ گار بناتی ہے اور توبہ اس کو

ایمان کی طرف واپس لے آتی ہے۔ برعکس اس کے کافر کے گناہ کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اسی گناہ گارانہ طرزِ عمل اور طرزِ زندگی کو اپنے لیے مناسب اور لذیذ اور درست سمجھتا ہے، اس کو خدا کی اور اس کے حکم کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ اس نے اس فعل کو گناہ اور حرام قرار دیا ہے، وہ پورے اصرار و انکبار کے ساتھ اسی فعل کا ارتکاب کیے جاتا ہے اور ندامت اس کے پاس نہیں پھٹکتی۔ یہ دوسری قسم کی گناہ گاری سلبِ ایمان کی موجب ہے اور یہ بجائے خود کبیرہ ہے خواہ اس جذبہ کے ساتھ کوئی ایسا کام ہی کیا جائے جس کو عرفِ عام میں "صغیرہ" سمجھا جاتا ہو۔ ان دونوں قسم کے گناہوں کو ایک ہی حیثیت دینا اور ان پر یکساں کفر کا حکم لگا دینا بالکل غلط ہے اور اس قسم کی افراط و تفریط خود کبیرہ کی تعریف میں آتی ہے۔ پہلی صدی سے آج تک بجز خارجیوں کے، یا معتزلہ کے ایک گروہ کے اور کسی نے یہ رائے قائم نہیں کی۔"

پھر دوسری قسم کے کفر کے متعلق میں نے لکھا تھا:۔

"اس چیز کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ شریعت نے ایسی تکفیر کو ہر کس و ناکس کی رائے کا کھلونا نہیں بنایا ہے۔ جس طرح کسی انسان کے جسمانی قتل کے لیے یہ شرط ہے کہ نظامِ اسلامی موجود ہو اور با اختیار قاضی تمام شہادتوں اور پوری صورتِ حال پر اچھی طرح غور کر کے پوری تحقیق کے بعد یہ رائے قائم کرے کہ یہ شخص واجب القتل ہے تب اسے قتل کیا جا سکتا ہے، اسی طرح ایک شخص کے روحانی قتل یعنی تکفیر کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ اس کے اوپر جو الزامِ کفر لگایا گیا ہے اس کی ایک قاضی شرع پوری تحقیق کرے، اس کا اپنا بیان لے، اس کے اقوال و افعال کو جانچ کر دیکھے، شہادتوں پر غور کرے اور اس کے بعد فیصلہ کرے کہ یہ شخص جماعتِ مسلمین سے کاٹ کر پھینک دینے کے لائق ہے۔"

غور کیجیے۔ جو لوگ اس قدر صاف اور صریح بیان کے باوجود مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں

خوارج کی طرح گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتا ہوں وہ کتنا بڑا جھوٹ بولتے ہیں اور اسے پھیلا کر کتنا بڑا وبال اپنے سر لیتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ مجھ پر یہ الزام آج وہ لوگ لگا رہے ہیں جن کا اپنا دامن بہت سے اگلے اور پچھلے مسلمانوں کی تکفیر سے آلودہ ہے اور جن کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے بہت سے فتاوائے تکفیر موجود ہیں۔ کیا یہ لوگ میری بھی کوئی ایسی تحریر پیش کر سکتے ہیں جس میں میں نے کبھی کسی مسلمان کی تکفیر کی ہو؟

(۳) آپ کے تیسرے سوال کے متعلق میں پھر یہ پوچھتا ہوں کہ آخر یہ سوال پیدا کہاں سے ہوا ہے؟ کیا واقعی میری کوئی ایسی تحریر پیش کی جا سکتی ہے جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہو کہ ان بزرگوں کے متعلق میرے خیالات جمہور اہل سنت سے مختلف ہیں؟ اس الزام کے ثبوت میں میری بعض تحریروں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر ان کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اور ان کے اندر طرح طرح کی تحریفات کر کے ان کو ایسے معنی پہنائے گئے ہیں جو میرے خیالات کے بالکل برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں ایک طرف ان دانستہ تحریفات کو دیکھتا ہوں جو مجھے زبردستی مجرم بنانے کے لیے کی گئی ہیں، اور دوسری طرف ان محرفین کے جبّوں اور عماموں اور اُن کے تقویٰ کی شہرتوں کو دیکھتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کے متعلق کیا رائے قائم کی جائے۔ افسوس۔ ان لوگوں کو خود اپنی عزت کا بھی پاس نہیں۔ یہ ذرا نہیں سوچتے کہ پاکستان و ہندوستان میں ہزاروں انسان موجود ہیں جنہوں نے میری کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ جب ان کے فتووں میں میرے خلاف اس قسم کے بے بنیاد الزامات دیکھیں گے تو ان کی نگاہ میں ان کی کیا وقعت رہ جائے گی۔

میں نہ صرف آپ کو بلکہ ان تمام لوگوں کو جن تک یہ الزام پہنچے، یہ مشورہ دیتا ہوں کہ صرف مخالفین کے پیش کردہ اقتباسات پر اعتماد نہ کریں بلکہ میری جن عبارات کے حوالے دیے جاتے ہیں انہیں میری اصل کتابوں میں نکال کر دیکھیں اور ان کے سیاق و سباق کو بھی ساتھ ہی دیکھ لیں۔ اس کے بعد انہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ اس الزام کی حقیقت کیا ہے۔

لہ اس مسئلے پر میری مفصل تصریحات کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب تفہیمات حصہ دوم، مضمون نمبر ۱۰، ۱۱، ۱۲۔

(۴) آپ نے چوتھے نمبر پر جو سوال کیا ہے اس کا جواب "ترجمان القرآن" میں اس سے پہلے بارہا دیا جا چکا ہے۔ اگر آپ کی نگاہ سے وہ جوابات گذر چکے ہوتے تو اس سوال کی حاجت نہ پیش آتی۔ بہرحال جب آپ نے یہ سوال کیا ہے تو میں اس کا آج کوئی تازہ جواب دینے کے بجائے اپنے وہ جوابات نقل کیے دیتا ہوں جواب سے کئی برس قبل مَیں نے اس وقت دیے تھے جب اس الزام تراشی کی ابتدا ہوئی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں سب سے پہلے مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے از راہِ عنایت دبی زبان سے میرے متعلق اس شبہ کا اظہار کیا تھا۔ اس پر مَیں نے اپنے مضمون "رفع شبہات" میں عرض کیا تھا:

"آپ کو میرے جرأت آمیز الفاظ سے شاید یہ گمان گزرا ہوگا کہ میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں۔ حالانکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ بڑے مراتب تو درکنار اگر صرف سزا سے بچ جاؤں تو یہ بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے۔"

(ترجمان القرآن۔ ستمبر، اکتوبر و نومبر ۱۹۴۱ء)

اس کے بعد اسی زمانہ میں جناب مولانا سید سلیمان ندوی نے میری ایک عبارت کو توڑ مروڑ کر اس سے یہ معنی نکالے کہ مَیں مجدد ہونے کا مدعی ہوں، حالانکہ مَیں نے اُس عبارت میں اپنی حقیر کوششوں کو تجدید دین کی مساعی میں سے ایک سعی قرار دیا تھا۔ اُن کے اس صریح الزام کے جواب میں مَیں نے عرض کیا تھا:۔

"(کسی کام کو تجدیدی کام کہنے سے) یہ لازم نہیں آتا کہ جو تجدیدی کام کرے وہ مجدّد کے لقب سے بھی ملقب ہو، صدی کا مجدّد ہونا تو اس سے بلند تر بات ہے۔ اینٹیں چن کر دیوار بنانا بہرحال ایک تعمیری کام ہے، مگر کیا یہ لازم ہے کہ جو چند اینٹیں چُن دے وہ انجینئر بھی کہلائے؟ اور پھر انجینئر بھی معمولی نہیں بلکہ اپنی صدی کا انجینئر؟ اسی طرح کسی کا اپنے کام کو تجدیدی کام یا تجدیدی کوشش کہنا، جبکہ فی الواقع وہ تجدید دین حق

ہی کی غرض سے یہ کام کر رہا ہو، محض ایک امرِ واقعہ کا اظہار ہے اور اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مجدد ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور اس صدی کا مجدد بنا چاہتا ہے۔ کم ظرف لوگ بے شک تھوڑا سا کام کر کے اونچے اونچے دعوے کرنے لگتے ہیں، بلکہ کام کا ارادہ ہی دعوے کی شکل میں کرتے ہیں۔ لیکن کسی ذی فہم آدمی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کام کرنے کے بجائے دعوے کریگا۔ تجدید دین کا کام ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بہت سے لوگ کر رہے ہیں۔ خود مولانا (حضرتِ معترض) کو بھی ہم انہی میں شمار کرتے ہیں۔ مَیں نے اپنی حدِ استطاعت تک اس خدمت میں حصہ لینے کی سعی کی ہے اور اب ہم چند خدام دین ایک جماعت کی صورت میں اسی کے لیے کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ جس کے کام میں بھی اتنی برکت دے کہ واقعی اس کے ہاتھوں دین کی تجدید ہو جائے وہی درحقیقت مجدد ہو گا۔ اصل چیز نہ آدمی کا اپنا دعوٰے ہے نہ دنیا کا کسی کو مجدد کے لقب سے یاد کرنا۔ بلکہ اصل چیز آدمی کا ایسی خدمت کر کے اپنے مالک کے حضور پہنچنا ہے کہ وہاں سے مجدد کا مرتبہ حاصل ہو۔ مَیں مولانا کے حق میں ایسی چیز کی دعا کرتا ہوں، اور بہتر ہو کہ وہ بھی "عنقا را بلند است آشیانہ" کہنے کے بجائے دوسروں کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ ان سے اپنے دین کی ایسی کوئی خدمت لے لے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض اسلامی الفاظ کو خواہ مخواہ ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی رومی عظمت کی تجدید کا داعیہ لے کر اٹھتا ہے اور رومیت کے پرستار اس کو مرحبا کہتے ہیں۔ کوئی ویدک تہذیب کی تجدید کا عزم لے کر اٹھتا ہے اور ہندویت کے پرستار اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔ کوئی یونانی آرٹ کی تجدید کے ارادہ سے اٹھتا ہے اور آرٹ کے پرستار اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ کیا ان سب تجدیدوں کے درمیان صرف ایک اللہ کے دین کی تجدید ہی ایسا جرم ہے کہ اس کا نام لیتے ہوئے آدمی شرمائے اور اگر کوئی اس کا خیال ظاہر کرے تو اللہ کے پرستار اس کے پیچھے تالی پیٹ دیں؟" (ترجمان القرآن دسمبر ۴۲ء و جنوری ۴۳ء)

ان تصریحات کے بعد بھی ہمارے بزرگانِ دین اپنے پروپیگنڈے سے باز نہ آئے کیونکہ میرے خلاف مسلمانوں کو بھڑکانے کے لیے منجملہ اور ہتھکنڈوں کے ایک یہ ہتھکنڈا بھی ضروری تھا کہ مجھ پر کسی دعوے کا الزام چسپاں کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں مسلسل یہ شبہ پھیلایا جاتا رہا کہ یہ شخص مہدویت کا دعویٰ کرنے والا ہے۔ اس پر میں نے جون ۱۹۴۶ء کے ترجمان القرآن میں لکھا:

"جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو جماعت اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہ کر سکیں گے، اور وہ سزا یہ ہے کہ انشاء اللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی اور ان کو بیان کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔"

اگر ان لوگوں کے دلوں میں خدا کا کچھ خوف اور آخرت کا کوئی یقین موجود ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ میرے اس جواب کے بعد پھر کبھی ان کی زبان پر یہ الزام آتا۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج کس جرأت کے ساتھ اسے ازسرِنو پھیلایا جا رہا ہے اور ترجمان القرآن کی قریبی اشاعتوں میں اس کے متعلق جو کچھ لکھ چکا ہوں اسے دیکھ لینے کے باوجود ان میں سے کسی کی زبان میں لکنت تک نہیں آتی۔ آخرت کا فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ ہے، مگر مجھے بتائیے، کیا دنیا میں ایسی ہی حرکتوں سے علماء کا وقار قائم ہونے کی توقع ہے؟

لطف یہ ہے کہ میری کتاب "تجدید و احیائے دین" جس کی بعض عبارتوں پر ان شبہات کی بنا رکھی گئی ہے، اور جس کے اقتباسات طرح طرح کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کر کے لوگوں کو بہکایا جا رہا ہے، اسی میں میرے یہ الفاظ موجود ہیں:

"نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے، اور نہ نبی کے سوا کسی کو یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعویٰ

کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ کر کے دکھا جانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں ہی اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں"

آج جو لوگ میری اس کتاب کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں ان سے پوچھیے کہ ان کو یہ عبارت نظر نہیں آئی یا انہوں نے دانستہ اسے چھپایا ہے؟

(۵) آپ کا آخری سوال بھی آج کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے متعدد مرتبہ مجھے اس سے سابقہ پیش آچکا ہے اور میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔ چنانچہ اس کا بھی آج کوئی نیا جواب دینے کے بجائے ایک پرانا جواب نقل کیے دیتا ہوں:

"میں تمام بزرگان دین کا احترام کرتا ہوں مگر پرستش ان میں سے کسی کی بھی نہیں کرتا، اور انبیاء کے سوا کسی کو معصوم بھی نہیں سمجھتا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ بزرگان سلف کے خیالات اور کاموں پر بے لاگ تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالتا ہوں، جو کچھ ان میں حق پاتا ہوں اُسے حق کہتا ہوں اور جس چیز کو کتاب و سنت کے لحاظ سے یا حکمت عملی کے اعتبار سے درست نہیں پاتا اس کو صاف صاف نادرست کہہ دیتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی غیر نبی کی رائے یا تدبیر میں خطا پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عظمت و بزرگی میں کوئی کمی آجائے۔ اس لیے میں سلف کی بعض رایوں سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کی بزرگی کا بھی قائل رہتا ہوں اور میرے دل میں ان کا احترام بھی بدستور باقی رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ بزرگی اور معصومیت کو ہم معنی سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک اصول یہ ہے کہ جو بزرگ ہے وہ خطا نہیں کرتا اور جو خطا کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بزرگ کی کسی رائے یا طریقے کو نادرست قرار دینا لازمی طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ ایسا خیال ظاہر کرنے والا ان کی بزرگی کا احترام نہیں کرتا اور ان کی خدمات پر قلم پھیرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اس مقام پر بھی نہیں رکتے بلکہ آگے بڑھ کر اس پر یہ الزام بھی لگاتے

ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھتا ہے۔ حالانکہ علمی معاملات میں ایک شخص کا دوسرے
کی رائے سے اختلاف کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ جس سے اختلاف کر رہا ہو اس
کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بڑا بھی سمجھے اور بہتر بھی۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے بکثرت
معاملات میں امام ابو حنیفہؒ کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اختلاف
یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ مختلف فیہ معاملات میں اپنی رائے کو صحیح اور امام صاحب کی
رائے کو غلط سمجھتے تھے۔ لیکن کیا اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ دونوں حضرات امام
ابو حنیفہؒ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو افضل سمجھتے تھے؟" (ترجمان القرآن۔ جون ۴۶ء)

مجھے امید ہے کہ اس عبارت سے آپ کو میرا مسلک پوری طرح معلوم ہو گیا ہوگا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اس مسلک سے اتفاق کریں، یا خود بھی اسے قبول کر لیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اس میں ضلالت کا کونسا پہلو ہے؟ اور اس کے ضلالت ہونے کے لیے کتاب و سنت میں دلیل کیا ہے؟ آپ بڑی خوشی سے میری کسی رائے کو، جو میں نے بزرگانِ سلف میں سے کسی سے اختلاف کر کے پیش کی ہو، رد کر دیں اور اُسی رائے کو ترجیح دیں جس سے میں نے اختلاف کیا ہے۔ بلکہ اگر آپ معتبر دلائل سے میری رائے کو مرجوح اور سلف کی رائے کو راجح ثابت کر دیں گے تو میں خود اس سے رجوع کر لوں گا۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ جب میں کتاب و سنت کے دلائل سے ایک رائے پیش کرتا ہوں اور کتاب و سنت ہی کی دلیل سے دوسری رائے قبول کرنے کے لیے تیار رہوں، تو آخر محض اپنی رائے پیش کر دینے سے میں کس گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہوں؟ اور میری رائے صرف اس لیے کیوں لازماً مرجوح ہے کہ میں خلف ہوں اور سلف کے ہر بزرگ کی رائے صرف اس وجہ سے کیوں راجح ہے کہ وہ سلف ہیں؟ دو چار صدی بعد پیدا ہونا کوئی قصور نہیں ہے جس کی وجہ سے آدمی کی رائے لازماً بے وزن اور اس کی حیثیت لازماً کمتر ہو جاتی ہو، اور دو چار صدی پہلے پیدا ہو جانا کوئی کمال نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی مقدس اور منزہ عن الخطا قرار پا جائے اور اس کی ہر رائے کو راجح ہونے کا ذاتی استحقاق حاصل ہو جائے۔

بعض نادان لوگ ہر اس اختلاف پر، جو بزرگانِ سلف میں سے کسی کی رائے یا کسی کے طریقہ سے کیا جائے، حدیث لعن اٰخر ھٰذہ الامۃ اولھا چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ وہ اختلاف کتنے ہی ادب کے ساتھ کیا گیا ہو، ان بزرگوں کی خدمات اور ان کے کمالات کا کتنا ہی اعتراف کرنے کے بعد کیا گیا ہو، اور کتنے ہی معقول دلائل کے ساتھ کیا گیا ہو۔ معلوم نہیں یہ لوگ اس حدیث کے معنی سے ناواقف ہیں، یا لفظ "لعنت" کا مفہوم نہیں جانتے، یا جان بوجھ کر محض دوسروں کو ملعون کرنے اور عوام الناس کو بھڑکانے کے لیے فرمودۂ رسول کے غلط استعمال کی جرأت کر بیٹھتے ہیں۔ بہرحال کوئی صاحبِ علم اور صاحبِ عقل آدمی تو کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ علمی تحقیقات میں ایک شخص کا دوسرے شخص سے مدلّل اختلاف "لعنت" کا ہم معنی ہے۔ اگر یہ لعنت ہے تو پھر آج ہمارے درمیان رائے اور تحقیق کے جتنے بھی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ سب ختم ہو جانے چاہئیں اور ان کا اظہار حرام ہونا چاہیے، کیونکہ لعنت تو معاصرین کے حق میں بھی جائز نہیں ہے۔

اس سلسلے میں، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ دو باتوں کی اور توضیح کر دوں۔ اگرچہ آپ نے ان کے بارے میں سوال نہیں کیا ہے، مگر وہ بھی ایک طرح سے آپ ہی کے سوال سے متعلق۔

اوّل یہ کہ میں نے فقہی مسائل میں مذہب حنفی کے مفتیٰ بہ اقوال کے خلاف جب کبھی کسی رائے کا اظہار کیا ہے، اپنے فتوے کی حیثیت سے نہیں کیا ہے بلکہ ایک تجویز کی حیثیت سے کیا ہے، اور اس غرض سے کیا ہے کہ وقت کے علماء اس پر غور کریں اور اگر میرے دلائل سے مطمئن ہوں تو میری تجویز کے مطابق فتوے میں تغیر کر دیں۔ میرے نزدیک ایسا کرنا حنفیت کے خلاف نہیں ہے اور مذہب حنفی میں اس کی گنجائش ہونے کے دلائل میں نے اپنی کتاب "حقوق الزوجین" (صفحہ ۶۰-۶۱) میں بیان کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ میں اصولاً اس بات کا بھی قائل ہوں کہ ہر صاحب علم کی تجویز پر فتویٰ نہیں ہو سکتا۔ فتوے ایک قانونی بیان کا نام ہے، اور نظامِ شریعت میں قانون صرف وہی ہو سکتا ہے جس پر یا تو اجماع ہو یا جسے جمہور علماء نے تسلیم کیا ہو۔ اس لیے جب تک ایک

تجویز کو اہلِ علم بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ قبول نہ کرلیں، وہ نہ قانون بن سکتی ہے اور نہ اس پر فتویٰ ہوسکتا ہے۔ اس بات کو بھی میں اپنی کتاب "اسلامی قانون" (صفحہ ۲۸-۲۹) میں بیان کرچکا ہوں۔ میرے اس مسلک کو سمجھ لینے کے بعد اب کوئی مجھے بتائے کہ اگر ایک شخص مصالح دینی کی بنا پر کسی فقہی مسئلے میں تغیرِ فتویٰ کی ضرورت محسوس کرے اور اسے محض ایک تجویز کے طور پر اہلِ علم کے غور کے لیے بدلائل پیش کردے تو کیا فی الواقع یہ کوئی گناہ ہے؟ اور کیا اس سے واقعی دین میں کوئی فتنہ پیدا ہوجاتا ہے؟

دوم یہ کہ میں فقہی مسائل میں انفراد کو پسند نہیں کرتا۔ میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے میں مذہبِ حنفی کے فتوے پر میرا اطمینان نہیں ہوتا تو مذاہبِ اربعہ میں سے دوسرے مذاہب کے احکام اور دلائل پر نگاہ ڈالتا ہوں اور اپنی بساط بھر ان کو جانچنے کے بعد ان میں سے کسی ایک کے فتوے کو ترجیح دیتا ہوں۔ شاذ و نادر ہی میں نے کبھی اس طریقہ سے ہٹ کر مذاہب اربعہ سے باہر کے کسی فتوے کو ترجیح دی ہے، اور اگر کبھی ایسا کیا بھی ہے تو بالعموم مجتہدینِ امت ہی میں سے کسی اور کی رائے کو قبول کیا ہے، محض اپنی منفرد رائے کم ہی کبھی پیش کی ہے۔ اگرچہ انفراد میرے نزدیک حرام نہیں ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے بہت زیادہ مضبوط دلائل کی ضرورت ہے، اور کم ہی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ کبھی میں نے کسی فقہی مسئلے میں کوئی ایسی رائے ظاہر کی ہو جس میں سلف میں سے کوئی بھی میرے ساتھ نہ ہو۔ اس طرح کی "غیر مقلدیت" کا مجھے خود اعتراف ہے اور میں اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں تاوقتیکہ سب و شتم کے بجائے کتاب و سنت کی دلیل سے اس کو گناہ ثابت نہ کردیا جائے۔

مسئلہ تقدیر کا اُلٹا استعمال

(نعیم صدیقی)

جہاں علم اور اختیار آیا، سمجھیے کہ ذمہ داریوں کے پہاڑ ساتھ آئے۔ جہاں انتخاب کا حق ملا وہاں خود بخود بھلے اور برے کا سوال پیدا ہوگا، اور بھلے اور برے کا سوال پیدا ہوا تو جزا و سزا کا مسئلہ نمودار ہوگا۔ جسے قوتِ فیصلہ مل گئی وہ امتحان میں پڑ گیا اور جو امتحان میں پڑا اس کی ناکامی اور کامیابی کا دارومدار خود اس کی مساعی پر ہے۔

لیکن حضرت انسان کا حال یہ ہے کہ علم اور اختیار تو لے لیا لیکن ذمہ داریوں سے اب کتراتے ہیں۔ امتحان میں تو پڑ گئے لیکن محنت کرنے سے یہ کہہ کر گریز کرتے ہیں کہ اگر ممتحن نے چاہا تو پاس کر دیگا، اور اگر کوئی پرچہ خراب کر بیٹھیں تو ارشاد فرمائیں گے کہ ممتحن نے تو ہمارے فیل کرنے کا فیصلہ کر ہی رکھا ہے، ہمارا کیا قصور! اسی لیے قرآن میں یہ بات کہی گئی ہے کہ آدمی کو صلاحیتیں تو وہ دی گئیں کہ یہ امانتِ خلافت کو اٹھانے والا بنا، لیکن اب خواہش پرستیوں اور آرام پسندیوں کے طفیل اس امانتِ گراں بہا کی ذمہ داریوں سے گریز بھی ہے، سو یہ رویہ بڑا ہی ظالمانہ اور جاہلانہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی عظیم الشان سلطنت کے دستور و آئین کے جو پہلو انسان پر بذریعہ وحی و الہام واضح کیے ہیں ان میں سے ایک پہلو تقدیر کا ہے۔ آخر یہ سلطنت بے چلائے نہیں چل رہی ہے بلکہ اس کے لیے کوئی منصوبہ بندیاں ہیں، کوئی نقشہ ہائے کار ہیں، کوئی پروگرام ہیں، کچھ قواعد و ضوابط ہیں، اسباب اور نتائج کا ایک سسٹم ہے، موجودات کا کوئی ریکارڈ ہے، حوادث کے لیے کوئی اوقات ہیں، حرکت ہے تو اس کے پیچھے مقاصد ہیں، عمل ہے تو اس کے پیچھے علم ہے، قوانین ہیں تو اس کے پیچھے حکمت ہے، تخریب و تعمیر ہے تو اس کے پیچھے کچھ مصالح ہیں اور تصادم و کشمکش ہے تو اس کے پیچھے کوئی اصول ہیں۔ ان ساری حقیقتوں کو جب سامنے رکھ کے دیکھا

جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ذرّے ذرّے کی کوئی تقدیر ہے اور تقدیر کے بغیر ہم موجودات میں سے کسی ایک کا بھی تصور نہیں کر سکتے۔ خَلَقَ، فَقَدَّرَ، فَهَدىٰ وہ روشن حقیقت ہے کہ جدھر نظر دوڑاؤ اُدھر ہی اس کے ثبوت بکھرے پڑے ہیں۔ خلق ہے تو قدر ہے، قدر ہے تو ہدایت ہے۔

اگر خالق کو خالق ماننے کے بعد تقدیر ساز اور ہادی نہ مانا جائے تو ایک ایسے ناقص خالق کا تصور حاصل ہوتا ہے کہ پھر اسے خالق ماننا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو خلق کرے اور اندھا دھند کرے جس کے سامنے کوئی اسکیم نہ ہو، جو قوتوں کی تقسیم کے لیے کوئی خاص پیمانہ نہ رکھتا ہو، جس کی عنایتوں اور جس کی قہرمانیوں کے لیے کوئی خاص اصول نہ ہو، جو اوقات کی تحدید نہ کرے، جو خزانوں کا احاطہ نہ رکھتا ہو، جو مخلوق کے علم سے کورا ہو وہ ایک ذہنی بُت تو ہو سکتا ہے، خدا نہیں ہو سکتا۔

لیکن اسی تقدیری نظام کی حدبندیوں کے اندر اُس کی تقدیر نے ہی انسان کو خلافت کا مقام دیتے ہوئے علم و اختیار سے نوازا ہے۔ اس کے لیے قدم قدم پر دوراہے بنا دیے ہیں، وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ! اسے خیر و شر کی قوتِ تمیز بھی دی ہے اور الہام کی روشنی بھی دی ہے کہ وہ جدھر قدم بڑھائے علم کے ساتھ بڑھائے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا۔ پھر اسے آزادی دی ہے کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ جی چاہے تو ایمان کا راستہ اختیار کرے اور جی چاہے تو کفر کی راہ پسند کرے۔

انسانی زندگی کی حالت کائنات میں ویسی ہی ہے جیسی کسی ریاست میں ایک نیم خود مختار (Autonomous) صوبائی یونٹ کی ہو۔ اس خود مختاری کی حدود جہاں تک وسیع ہیں وہاں تک آدمی جو چاہے کر گذرے، لیکن کچھ دور جا کر یہ حدود ختم ہو جاتی ہیں اور جبریت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس سرحد کے باہر آدمی چاہے جو بھی جتن کر لے وہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں برسے دستور جو محدود آزادی اسے حاصل ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔

جبر و اختیار کی دو حیثیتوں کے اس طرح جمع ہو جانے سے کوتہ نظر لوگ ہمیشہ بڑی الجھنوں

میں پڑے ہیں۔ جس کسی نے اپنے اختیار کا غیر معمولی مطالعہ کیا اس کی نگاہ سے جبر کا پہلو اوجھل ہو گیا، اور جس نے جبریت کا راز پا لیا اس کی نگاہ اختیار سے ہٹ گئی۔ پھر بارہا ایسا ہوا ہے کہ جبریت کے مظاہر کو لوگوں نے اختیار کے مظاہر سے ٹکرانے کی کوشش کی ہے اور ایک پہلو کے ماننے والوں نے دوسرے پہلو کی نفی کو لازم قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ پورا نظام جبریت اُس اختیار کی نفی نہیں کرتا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے، جسے ہم روزمرہ زندگی میں محسوس کرتے ہیں اور جس کو صراحتہً اللہ نے اپنے انبیاء کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اسی طرح ہمارا پورا دائرۂ اختیارات اُس نظامِ جبریت کو باطل نہیں کر سکتا جسے مانے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں اور جسے خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے۔

لیکن جہاں تک محض اختیار کے دعوے کا تعلق ہے اسے لے کر جو بھی اُٹھے اسے جبریت کی لہروں کے چند ہی تھپیڑے اصل حقیقت سے آشنا کر دیں گے۔ بخلاف اس کے جب لوگ محض جبریت کے مدعی بنتے ہیں تو اس چکر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جبریتِ تام اور اختیار کی کلی نفی کی طرف بالعموم وہ لوگ جاتے ہیں جو بہ حیثیتِ انسان اپنی فطری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام رہتے ہیں اور جن کے لیے اپنی خواہشات اور میلانات کی غلامی سے نکلنا بڑا شاق ہوتا ہے۔

ذمہ داریوں سے گریز کرنے والوں کو جتنی اچھی پناہ گاہ جبریت کے فلسفے میں حاصل ہوتی ہے اتنی کسی اور طرح حاصل نہیں ہوتی۔

چنانچہ اقامتِ دین کی دعوت کے علمبرداروں کو اس کا خوب اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ اس دعوت کے راستے میں فلسفۂ جبریت بعض اوقات بری طرح روک بنتا ہے اور یہ خواص سے لے کر عامیوں تک یکساں سرایت کیے ہوئے ہے۔ آپ لوگوں سے کہیے کہ غلبۂ دین کے لیے کچھ کرو تو جواب ملے گا کہ یہ سب کچھ تو اللہ کے بس میں ہے، جب تک اس نے دین کی مخالف طاقتوں کو سرفرازی دے رکھی ہے، کون ہے جو اس سرفرازی کو پستی سے بدل سکے۔ اور جب

تبدیلی کا وہ وقت آئے گا تو خود بخود اس کے سامان ہو جائیں گے! وہی بات کہ ؎

تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

بڑے بڑے مجرموں سے بات کیجیے تو وہ فوراً اپنی ذمہ داری "قسمت" کے سر ڈال دیں گے۔ ان کے خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو خلاصہ یہ نکلے گا کہ ہم از خود تو جرم کرنا نہیں چاہتے بلکہ نیک بن کر رہنے ہی کو پسند کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے ہمیں بالکل مجبور کر دیا ہے کہ ہم جرم کریں، لہٰذا اصلاح کا اگر ہم ارادہ بھی کریں اور اس کے لیے سعی بھی کریں تو رائگاں ہے۔ جیسا کہ حافظ نے کہا تھا ؎

در کوئے نیک نامی ما را گذر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

یعنی انسانی زندگی کے نیم مختار (Autonomous) صوبے کا حکمراں صوبے کا نظم و نسق ٹھیک سے نہیں چلاتا۔ اعلیٰ محلوں میں وقت گذارتا ہے، عیاشیاں کرتا ہے، دشمنوں کی مدافعت کا سامان نہیں کرتا، رعایا کی خبر گیری کا حق ادا نہیں کرتا، لیکن جب پوچھتے ہیں کہ تاج و تخت کی گراں بار ذمہ داریاں سر لے کر یہ کیا حال بنا رکھا ہے جناب نے؟ تو ارشاد ہو گا کہ دراصل یہ سب کچھ جو میں کر رہا ہوں یہ مرکزی حکومت کے خفیہ اثرات کے تحت کر رہا ہوں، میرا تو کوئی اختیار ہی نہیں ہے۔ بھلا کہاں بادشاہ سلامت اور کہاں مجھ جیسا ایک ناچیز وائسرائے! اختیار تو بادشاہ کا ہے، وائسرائے تو بس یونہی آلۂ کار ہوتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس طرح کی باتیں ہمیشہ اونچے درجے کی دینی و اخلاقی ذمہ داریوں کی دعوت کے جواب میں تو کہی جاتی ہیں، لیکن اپنی دن رات کی زندگی میں کوئی بھی جبریت کے فلسفے پر تکیہ نہیں کرتا۔ ہمارے ایک دوست، اس دعوت کے جواب میں کہ اپنی زندگی بدلیے، فرمانے لگے کہ اس میں ہمارا کیا اختیار، یہ تو خدا کی طرف سے ازل کے دن لکھا گیا تھا۔ اس پڑھن

سے عرض کیا گیا کہ آپ کا بچہ جب بیمار ہو جاتا ہے تو آپ رات کو سردی میں گرم بستر چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں، بہتر سے بہتر ڈاکٹر کو تلاش کر کے لاتے ہیں اور بہتر سے بہتر دوائیں اپنا مال خرچ کر کے حاصل کرتے ہیں، پھر تیمارداری میں اپنا آرام قربان کرتے ہیں ـــــ اس سارے سلسلہ میں تو آپ کو کبھی فلسفۂ جبریت یاد نہیں آتا اور کبھی آپ یوں نہیں سوچتے کہ بیماری اور صحت تو خدا نے پہلے ہی لکھ دی ہے پھر ہم کیوں علاج کے چکر میں پڑیں، مگر بس جہاں خدا کے دین کا کوئی مطالبہ سامنے آیا تو آپ نے جبریت کے فلسفہ کو عذر میں پیش کر دیا۔ اگر آپ بے روزگار ہو جائیں تو در در جا کر روزگار تلاش کریں، سفارشیں لے کے دفتروں میں گھومیں، ایک ایک کی منت سماجت کریں، اِدھر اُدھر سے معلومات حاصل کریں۔ گھر میں آٹا ختم ہو جائے تو کہیں سے اُدھار لے کر بھی آٹا خرید لائیں۔ کوئی آپ کی عزتِ نفس پر حملہ کر دے تو دماغ اور زبان اور ہاتھ پاؤں کی ساری قوتیں انتقام میں لگا دیں۔ کوئی آپ کا مال مار کھائے تو اس کے خلاف مقدمہ لڑنے کے لیے اپنی سی جو کچھ کر سکتے ہوں کر گذریں۔ ان معاملات میں تو کبھی تقدیر کا سوال پیدا نہ ہو۔ لیکن بات جب خدا و رسول کے احکام کی اطاعت کی آئے اور حمایتِ دین کے لیے آپ کو پکارا جائے تو آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ روزِ اول سے یہ معاملات طے ہو چکے، اب سوچنا کیسا اور کوشش کیسی؟ یا دونوں طرف جبریت کے آگے سر جھکائیے، یا دونوں طرف سعی کا حق ادا کیجیے۔ یہ کیا کہ اپنی خواہشات ہوں تو آپ ہمہ تن اختیار بن جائیں اور خدا و رسول کا حکم سامنے آئے تو جبریت کی پناہ گاہ میں جا چھپیں! براہِ کرم اس فریبِ نفس سے نکلیے!

یہ سن کر وہ بالکل لاجواب ہو گئے۔

تقدیر جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داریوں کا دوسرا نام ہے، اور شریعت بندوں کی ذمہ داریوں کی وضاحت ہے اور یہ وضاحت بھی خود اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ لیکن وہ بندے عجیب بندے ہوتے ہیں جو اپنی ذمہ داریوں سے تو بھاگتے ہیں لیکن خدا کی ذمہ داریوں پر بحث کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی ساری ذمہ داریاں بھی اُٹھا کر خدا کے سر ڈال دیں تاکہ ان کے سر کوئی ذمہ داری باقی نہ رہے۔

مسئلہ تقدیر کے بیان کا مقصد قرآن میں مسئلہ تقدیر کے جو پہلو بے نقاب کیے گئے ہیں وہ محض اسرار بیانی کے طور پر نہیں کیے گئے ہیں۔ بلکہ ان کا ایک مقصد ہے اور ان کا مقصد وہی ہے جو پورے قرآن کا مقصد ہے ــــ یعنی بندوں کو اللہ پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت پر آمادہ کرنا؛

آپ ذرا غور و فکر سے کام لیں تو یہ بات باور کرنے کے لیے آپ کی عقل ہرگز تیار نہ ہوگی کہ جس قرآن کا مدعا ایمان و اطاعت پر آمادہ کرنا ہو وہ کچھ ایسے نکتے بھی بیان کریگا جو ایمان سے فرار میں مدد دینے والے ہوں یا جن سے طاعت کا رجحان ہی ختم ہو جائے اور جذبات ہی سرد پڑ جائیں۔ پس جبریت مطلقہ کے قائلین جس طرز پر اپنے من گھڑت فلسفے کو طاعت سے گریز کرنے کے لیے دلیل بناتے ہیں وہ قرآنی منشا کے بالکل خلاف ہونا چاہیے۔ یہ جبریت محضہ کی دلیل تو تمام انبیا کی بعثت اور تمام کتب آسمانی کے نزول اور تمام ہجرتوں اور تمام جہادوں اور شہادتوں اور مالی و جانی قربانیوں کو جو دین کی راہ میں کی گئیں بالکل بے کار اور فضول بنا کے رکھ دیتی ہے۔ جب اللہ بالجبر لوگوں سے نیکی اور بدی کرا رہا ہو تو دعوتِ حق کے کیا معنی؟ کفر و دین، فسق و تقویٰ اور معروف و منکر کی تقسیم کا کیا مطلب؟ انبیاء کو کھڑا کرنے کا کیا فائدہ؟ اور کتابیں نازل کرنے کا کیا مقصد؟ یہ فلسفہ تو گویا اللہ میاں پر بہتان باندھتا ہے کہ نعوذ باللہ، وہ تضاد کار اور لایعنی کام کرنے والے ہیں۔

پس لازم ہے کہ قرآن کا فلسفۂ تقدیر سراسر طاعت و تقویٰ کی طرف لے جانے والا ہو، نہ کہ اس سے فرار کے چور دروازے کھولنے والا۔ آپ اُن سارے مقامات کا جائزہ لیں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار، اپنی مشیت، اپنی جباری و قہاری، اپنے تسلط اور غیر محدود علم و قدرت کا ذکر کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں کہیں جبریت کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں یا تو لوگوں کو کسی معصیت سے ہٹانا مطلوب ہے یا کسی طاعت کی طرف بلانا مطلوب ہے۔

قرآن میں تقدیر کا بیان شریعت سے بے نیاز ہونے کے لیے نہیں بلکہ شریعت کا پابند بنانے کے لیے آیا ہے۔ خدا کی مشیت کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس کی رضا کی پیروی چھوڑ دینے کے لیے اور شیطان کا دامن تھام لینے کے لیے لوگوں کو ایک دلیل مل جائے بلکہ اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان

اللہ کی رضا کے پیچھے چلنے ہی کو اپنے لیے لازم سمجھے۔ وہاں منشا یہ ہے کہ لوگ بدی سے مضبوط ہو کر لڑ سکیں اور یہاں اثر یہ لیا گیا کہ اُلٹا مجاہدین بدی کے سامنے ہتھیار ڈال کے پڑ رہیں! کیسا دلچسپ ماجرا ہے کہ قرآن نے فلسفۂ تقدیر کو جس مدعا کے لیے استعمال کیا ہے دنیا اس کے بالکل الٹ استعمال کرتی ہے۔

آئیے ذرا قرآن کو ملاحظہ کیجیے:

ذکرِ تقدیر برائے عزمِ صمیم | سورۂ انعام میں نبی صلعم کی زبان سے یہ اعلان کرایا جاتا ہے کہ:-

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ۝

اے محمد! اعلان کر دیجیے کہ مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ کہہ دیجیے کہ میں تمہاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ اگر میں ایسا کرتا تو راہِ حق سے بھٹک گیا ہوتا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوتا۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۔ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۔

کہہ دیجیے کہ میں اپنے آقا کی طرف سے ایک روشن دلیل پر قائم ہوں لیکن تم نے اسے جھٹلا دیا ہے میرے بس میں وہ کچھ (یعنی عذاب) ہے ہی نہیں جس کے لیے تم جلد بازی کر رہے ہو۔ اللہ کے سوا کسی اور کو فیصلہ دینے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ حق کو بیان کر دیتا ہے اور (پھر جو نہ مانے اس کے لیے) وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دیجیے کہ اگر میرے بس میں وہ کچھ ہوتا جس کے لیے تم جلد بازی کر رہے ہو تو میرے تمہارے درمیان اس جھگڑے کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا ۔۔۔۔ اور اللہ خود ظالموں کو (اور ان کے لیے عذاب بھیجنے کے موقع کو) خوب جاننے والا ہے۔

یہ اعلان اپنے ماحول میں طوفان کی ایک لہر سے کم نہ ہوگا۔ مخالفین حق کی کثیر تعداد کے سامنے اس دو ٹوک طریق سے اپنے عزم کو کہہ دینا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا تھا اور اس کے نتائج جو ممکن تھے وہ ایک ایک مسلمان کے سامنے تھے۔ اس موقع پر نظامِ تقدیر کی طرف کچھ اشارات یوں کیے گئے :-

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو ط ویعلم ما فی البر والبحر وما تسقط من ورقۃٍ الا یعلمھا ولا حبۃٍ فی ظلمٰتِ الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین ۔

(الانعام - رکوع ۷)

اور غیب (کے خزانہ ہائے اسرار) کی کنجیاں اسی کے قبضے میں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں اور جو کچھ بحر و بر میں ہے اس کو وہ جانتا ہے اور کوئی پتہ تک بغیر اس کے نہیں گرتا کہ اسے اس کا علم ہو، اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا ہے اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے کہ جو ایک صاف صاف لکھی ہوئی (کتاب میں درج) نہ ہو۔

اللہ کی قدرت اور اس کی صفات کا یہ بیان محض برائے وزنِ بیت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرف اپنے اندر کفار کے لیے دھمکی لیے ہوئے ہے، دوسری طرف اس میں اللہ کے آگے جھکنے کی دعوت مخفی ہے، اور تیسری طرف اس کا منشا نبی صلعم اور مومنین کے اس عزم کی پشت پناہی کرنا ہے جسے اوپر کی آیات میں مخالفینِ حق کے سامنے کھول کے رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا اس اعلان کے نتیجے میں نمودار ہونے والے حوادث میں نبی صلعم اور آپ کے پیروؤں کے لیے بہترین سامانِ استقامت ہے۔

ذکرِ تقدیر برائے استقامت خدا کو رب مان لینا یوں تو سستا کھیل ہے، لیکن جب خدا کو رب ماننے سے مصنوعی رب بگڑتے ہیں تو پھر قدم جما کے کھڑا ہونا ہر آدمی کا کام نہیں رہتا۔ قرآن میں اہلِ ایمان کو آزمائشوں کے مقابلے میں درسِ استقامت دیتے ہوئے بھی تقدیر کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

مثلاً سورۂ عنکبوت کا موضوع ہی آزمائش میں استقامت کی تعلیم ہے۔ آغازِ کلام یوں ہوتا ہے کہ:۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون ۵ ولقد فتنّا الذین من قبلھم فلیعلمنّ اللّٰہ الذین صدقوا ولیعلمن الکٰذبین ۵ (۲،۳) پھر آگے چلیے تو آتا ہے: ومن الناس من یقول آمنا باللّٰہ فاذا اُوذی فی اللّٰہ جعل فتنۃ الناس کعذاب اللّٰہ (۱۰)

اِس سلسلۂ بیان میں تقدیر کی حقیقتیں یوں بے نقاب کی جاتی ہیں:۔

(۱) کل نفس ذائقۃ الموت ثم الینا ترجعون ۵ (۵۷) — (ہر جان (کی تقدیر یہ ہے کہ وہ) موت کا لقمہ بننے والی ہے، پھر تم (حساب کے لیے) ہمارے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

(۲) وکاَیّن من دآبۃٍ لا تحمل رزقھا ج اللّٰہ یرزقھا وایاکم ج وھو السمیع العلیم (۶۰) — اور کتنے ہی جاندار (تمہارے سامنے) ہیں کہ اپنا رزق (اپنی پیٹھ پر) لادے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان سب کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی! اور وہ تمہارے (مطالبوں کو) سننے والا اور (تمہاری ضروریات کو) جاننے والا ہے۔

(۳) اللّٰہ یبسط الرزق لمن یشآء من عبادہ ویقدر لہ ج ان اللّٰہ بکل شیءٍ علیم ۵ (۶۲) — اللہ اپنے بندوں میں سے جس کسی کے لیے چاہتا ہے رزق کو وسیع کر دیتا ہے اور (چاہتا ہے تو) سکیڑ دیتا ہے۔ اور یقیناً وہ (رزق کے اس نظام سے تعلق رکھنے والی) ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہاں اس بیان کا صاف مقصد یہ ہے کہ موت سے خوف کھانا چھوڑ دو، یہ تو آنی ہے، فکر کرو تو اس کی کہ موت کے بعد خدا کے سامنے حساب کے لیے پیش ہوگے تو اُس وقت کیا ان لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہو جو موت سے ڈر کر حق سے ہٹ گئے یا ان لوگوں میں جنہوں نے حق کے لیے متاعِ جان بھی بازی میں لگا دی؟ دوسری بات یہ سمجھائی گئی کہ یہ کاوش کرنا بھی چھوڑ دو

کہ گھر بار اور روزگار تم سے چھوٹ جائیں گے، ان سارے حالات کے باوجود اللہ تم کو رزق دینے والا ہے جس طرح وہ تمہارے سامنے ہر جاندار کو دے رہا ہے۔ یہ اسی کے اختیار میں ہے کہ کسی کو کم دے اور کسی کو زیادہ دے پس تم رزق کی تنگی کے اندیشے سے حق سے انحراف نہ کرنا۔

اب دیکھ لیجیے کہ یہاں تقدیر کا بیان صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ اہل ایمان حق کی حمایت ونصرت اور استقامت کی ذمہ داریوں میں کوتاہی نہ کریں۔

بالکل اسی مقصد کے لیے مسئلہ تقدیر ایک دوسرے موقع پر بھی بیان ہوا ہے۔ وہاں بھی ایک چیلنج کے انداز میں نبی صلعم سے دینِ توحید پر عزم صمیم کا اظہار کرایا جاتا ہے کہ قل یاآیھا الناس ان کنتم فی شکٍ من دینی فلا اعبد الذین تعبدون من دون اللہ ولکن اعبد اللہ الذی یتوفٰکم ج وامرت ان اکون من المومنین ۵۔ پھر یہ حکم اور تنبیہ کی کہ:
وَاَقِمْ وجھک للدین حنیفاً ج ولاتکونن من المشرکین ۵ ولا تدعُ من دون اللہ مالا ینفعک ولایضرک ج فان فعلت فانک اذاً لمّن الظالمین ۵

ذرا محسوس کیجیے کہ یہ مقام کیا ہے؟ حکم ہوا ہے کہ صاف صاف کہہ دو کہ اگر کسی کو پہلے کوئی شبہ تھا تو وہ آج سن لے کہ میں اللہ کے سوا تمہارے معبودوں کی عبادت کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوں۔ پھر مطالبہ ہے کہ دین کی طرف یکسوئی کے ساتھ رُخ کر لو!

یہ کہتے ہوئے آنے والی آزمایشوں کے بارے میں اطمینان دلایا کہ اللہ کے سوا جو طاقتیں بھی ہیں وہ "لاینفعک" اور" لایضرک" کے درجے میں ہیں۔ پھر مثبت طور پر اپنے کامل اختیارات کو اللہ نے بیان فرمایا کہ:۔

وان یّمسسک بضرٍّ فلا کاشف لہٗ الا ھو ج وان یُّردک بخیرٍ فلا رآدَّ لفضلہ ط	اگر وہ (اللہ) تم کو کوئی نقصان پہنچائے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں کہ جو اس سے نجات دلا سکے، اور اگر وہ تمہارے لیے کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو پھر اس کے فضل کو روکنے والا بھی کوئی نہیں۔

یہ ہے زہے عزم وثبات اور یہ ہے وعظ استقامت! ـــ لیکن یاروں نے اس سے بزدلی، جمود، بے حسی اور بے حمیتی کے جواز کے لیے طرح طرح کے نکتے نکال لیے!

حق کی طرف پیشقدمی کا درس سورۂ الحدید میں جو آیت مغفرت ربّی اور ارض وسما جیسی وسیع جنت کی طرف پیش قدمی کرنے کا جرس بجاتی ہے اسے ملاحظہ کیجیے۔ فرمایا: سابقوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا کعرض السماء والارض "اور پھر متصلاً نظام تقدیر کا ذکر کیا تاکہ ان وادیوں میں پیشقدمی کرنے والوں کو جو مہالک خوفزدہ کر سکتے ہیں ان کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سب کچھ اللہ کے بس میں ہیں اور وہ بہرحال اپنی طرف آنے والوں کا خود پاسبان ہے۔ کیا ہی تسکین بخش الفاظ ہیں:-

ما اصاب من مصیبۃ فی	کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ جو تم کو زمین میں پہنچے یا
الارض ولا فی انفسکم الا فی	خود تمہاری جانوں کو پہنچے، مگر وہ اس سے قبل کہ وجود
کتٰب من قبل ان نبرأھا ان	میں آئے ہمارے نوشتہ میں لکھی ہوئی ہو گی، اور یہ
ذالک علی اللہ لیسیر ہ	صورت (کہ ایک شے کے وجود میں لانے سے قبل

اس کی تقدیر کا پورا پورا علم اللہ کو ہو) اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے،

لیجیے، یہاں اس حقیقتِ تقدیر کی وضاحت کا مقصد بھی سن لیجیے:

لکیلا تأسوا علیٰ ما فاتکم ولا	(یہ وضاحت اس لئے ہے) کہ تم جو کچھ ہاتھ سے جائے اس پر
تفرحوا بما اٰتٰکم	افسوس نہ کرو اور جو کچھ تمہیں حاصل ہو اس پر اکڑ نہ جاؤ۔

بس یہ الفاظ ہیں جو حقیقتِ تقدیر کے قرآن میں بیان کیے جانے کا مقصد واضح کرتے ہیں (آل عمران میں بھی یہی بات دُہرائی گئی ہے) تعلیم یہ دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی جنت رضا کی طرف جو لوگ اقدام کرنے کا فیصلہ کریں اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ اطاعت کے مقامات سے گذرتے ہوئے ہر نقصان کے غم سے اور ہر فائدے پر اکڑنے سے پاک رہیں ورنہ نقصانات کے افسوس میں اگر وہ بکھر گئے یا فوائد کے نشے میں آ گئے تو طاعت کا دامن چھوٹ جائیگا اس مقامِ استقامت جنفیت پر چلنے کیلیے مسلمانوں کو تقدیر کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اس کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ نفع ونقصان اللہ کی طرف سے ہیں، ایک منصوبے کے تحت ہیں، ایک حکمت کی بنیاد پر ہیں، اٹل ہیں، اور حق پر چلو یا باطل پر، ان وادیوں سے ہو کر نکلے بغیر تمہارے لیے کوئی چارہ نہیں۔ (باقی

چند نئی مصری مطبوعات

(از جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)

مصر عرب دنیا کا مرکز ہے اور وہی پورے عربستان کے لیے فکری غذا فراہم کرتا ہے۔ عرب ملکوں کی اسلامی تحریکوں اور فکری رجحانات کا سراغ لگانا ہو تو مصر کی مطبوعات اور علمی و ادبی تصنیفات کو کھنگالیے۔ خوش قسمتی سے مصر اس وقت ایک صحیح اسلامی دعوت کا مرکز بھی ہے، جس کے اثرات شام، عراق اور شرق اردن میں پوری طرح پھیل چکے ہیں۔ کویت، بحرین، حجاز، نجد، اور یمن کے ریگستان، چٹیل میدان اور سبزہ زاروں میں بھی یہ دعوت قدم جما رہی ہے۔ عربستان کے مغربی حصے (مراکش، الجزائر، طرابلس الغرب، تونس) میں ابھی اس کے اثرات نمایاں نہیں لیکن یورپ اور امریکہ کے عرب مہاجرین میں دعوت کا خاصا اثر ہے۔

ان حالات میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اسلامی دعوت کے علم بردار عرب ملکوں کے فکری رجحانات اور اسلامی تحریکوں کا جائزہ لیتے رہیں، اور جو لوگ خود کسی وجہ سے عربی اخباروں اور کتابوں کا مطالعہ نہ کر سکتے ہوں وہ بھی اِن ملکوں کے نئے رجحانات اور فکری تبدیلیوں سے باخبر رہیں۔ یہ مختصر تحریر اسی سلسلے کی ایک حقیر کوشش ہے۔ اس میں مصر کی چند نئی مطبوعات پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ان کے افکار و خیالات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتابیں اور پمفلٹ بڑی تعداد میں آتے رہتے ہیں۔ ہم نے صرف چند نمایاں کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ پسند کیا گیا تو آئندہ بھی اِن صفحات میں کبھی کبھی عربی مطبوعات پر تبصرہ ہُوا کرے گا۔ ان شاء اللہ۔

ہاں! ان مصری مطبوعات کے ضمن میں مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی کے بعض رسائل

پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ وہ آج کل دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں عرب ملکوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ مصر کی مرکزیت کے پیش نظر وہاں زیادہ قیام رہا اور مختلف انجمنوں کے زیر اہتمام متعدد خطبے دیے اور ہندوستان کی اسلامی تحریکوں اور فکری رجحانات کا تعارف کرایا۔ یہ رسالے مصر میں چھپے ہیں، اس لیے مصری مطبوعات کے ضمن میں ان کا تعارف شاید ناموزوں نہ خیال کیا جائے۔

(۱) مِنْ هُنَا نَبْدَأُ | مصنف شیخ خالد محمد خالد ازہری۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ نام کا لفظی ترجمہ ہے "ہم یہاں سے شروع کرتے ہیں"۔

یہ کتاب مصر کے اس دور کی ترجمانی کرتی ہے جب اسلام وہاں بے کس تھا۔ ہر لکھنے والا جو چاہتا اسلام اور قرآن کے متعلق لکھ ڈالتا۔ گو اب حالات بدل چکے ہیں اور اس حد تک بدل چکے ہیں کہ طٰہٰ حسین، محمد حسین ہیکل اور عباس محمود عقاد جیسے کفر و الحاد کے داعی اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سیرتیں لکھ رہے ہیں۔ ان حضرات کے فکر و عمل میں کوئی تبدیلی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، مگر یہ واقعہ ہے کہ حالات کی تبدیلی سے بازار کی مانگ بدل گئی ہے، اور یہ حضرات ایکٹروں کی طرح "طلب" کے مطابق منڈی میں مال پہنچا رہے ہیں۔ ممکن ہے بعض سادہ دل مسلمانوں کو ہماری یہ بات حیرت انگیز معلوم ہو۔ مگر افسوس کہ صورتِ حال یہی ہے۔ ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہو گا۔ اِن اصحابِ قلم میں سے ایک صاحب نے، جو ماشاء اللہ اسلامی نظامِ حکومت کے بڑے مداح ہیں، ایک مرتبہ فرمایا کہ "اگر رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی بنفسِ نفیس دوبارہ آکر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو میں پہلا مخالف ہونگا" (العیاذ باللہ)۔ لیکن اس کے باوجود اب بازار کی مانگ دیکھکر یہی لوگ اسلامی نظامِ حکومت کی اس طرح مدح سرائی کرتے ہیں کہ گویا ان سے بڑھ کر کوئی اس نظام کے قیام کا خواہشمند نہیں ہے۔

حالات کی اس تبدیلی کے باوجود کبھی کبھار مِنْ هُنَا نَبْدَأُ جیسی کتابیں اب بھی نکل آتی ہیں۔ بدنصیبی سے اس کے مصنف ازہر کے سند یافتہ عالم ہیں اور مصر میں دینی خدمات پر

مامور رہ چکے ہیں۔ کتاب کا مقصود اصل میں یہ ثابت کرنا ہے کہ "اسلام حکومت کا کوئی نظام لے کر نہیں آیا" اور یہ کہ "حکومت اور دین، دو الگ الگ چیزیں ہیں"۔ علمائے ازہر کی طرف سے یہ کوئی پہلی سرزنش نہیں۔ آج سے کوئی پچیس برس پہلے علی عبدالرازق صاحب اسی موضوع پر "الاسلام و اصول الحکم" کے نام سے ایک کتاب لکھ چکے ہیں، جس پر ان کی عالمیت کی سند چھین لی گئی تھی اور انہیں "فضلائے شرعی" کے منصب سے بھی الگ کر دیا گیا تھا۔[1] اور تو اور خود شیخ مصطفیٰ المراغی (سابق شیخ الازہر) محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیاۃ محمد" کے مقدمہ میں تحریر فرما چکے ہیں کہ "اسلام عقائد و عبادات کے باب میں تو مفصل اور قطعی بیانات لے کر آیا ہے، لیکن حکومت، معاشرہ اور خاندان وغیرہ کے متعلق اس کی تعلیمات بالکل مجمل اور مبہم ہیں"۔

یہ کتاب ضبط بھی ہوئی، پھر عدالت نے بری کر دیا۔ علمائے ازہر کو خاموش کرنے کے لیے جج نے اپنے فیصلے میں سابق شیخ الازہر محمد مصطفیٰ المراغی کے اُن "ارشادات عالیہ" سے بھی استدلال کیا ہے جن کا ذکر ابھی اوپر آ چکا ہے۔

کتاب کے ۴ باب ہیں:

(۱) الدین ۔ ۔ ۔ لا الکہانۃ	کہانت[2] نہیں بلکہ دین۔
(۲) الخبز ھو السلام	روٹی ہی میں امن ہے۔
(۳) قومیۃ الحکم	قومی "حکومت" (یعنی حکومت کا شریعت الٰہی سے بے نیاز اور قومی حاکمیت پر مبنی ہونا)
(۴) المرأۃ المعطّلہ	معطل چھکڑا (عورتیں)

[1] چند سالوں کے بعد پھر عالمیت کی سند واپس مل گئی اور منصب بھی بحال ہو گیا۔ شیخ خالد کی سند فضیلت بھی مورد عتاب تھی، نہیں معلوم آخر فیصلہ کیا ہوا؟

[2] کہانت کا لفظ پاپائیت اور Priesthood. کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ مذہب تو گوارا ہے مگر مذہبی طبقے یعنی علماء کا اقتدار گوارا نہیں ہے۔

پہلے باب میں علماء کرام کی خبر لی گئی ہے اور انہیں دنیا کی تمام برائیوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اشتراکیت کی دعوت ہے، مگر قانون کی شدت کے باعث دبے الفاظ میں یہ دونوں موضوع (علماء کی مذمت اور اشتراکیت کی تبلیغ) مصنف کو بہت مرغوب ہیں۔ ان کی نئی کتاب مواطنون لا رعایا[1] (رعیت نہیں، بلکہ اہل وطن) جسے بعض نقاد اس رسوائے عالم کتاب کا "کفارہ" قرار دے رہے ہیں، بھی علماء کی جا و بے جا مذمت اور روس کی ثنا خوانی سے پُر ہے۔ ہر جگہ امریکہ اور یورپ کے مفکرین کے اقوال سند کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ قرآن و حدیث سے بھی کام لیا گیا ہے، مگر مشکل ہی سے کوئی آیت یا حدیث کا کوئی ٹکڑا تحریف سے محفوظ رہا ہو۔

تیسرے باب میں خاص طور پر "الاخوان المسلمون" اور ان لوگوں سے خطاب ہے، جو اس دور میں اسلامی نظام حکومت کے داعی اور اس کے قیام کے لیے کوشاں ہیں۔ چوتھے باب میں عورتوں کی مظلومیت اور بے کسی کا رونا رویا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو ایک سمجھتے اور مسلمان قوم کی ہزار سالہ برائیوں اور بداعمالیوں کو غریب اسلام کے سر تھوپتے ہیں۔ تومیۃ الحکم کے باب میں دین کے جھوٹے علمبرداروں، بے اصول مسلمانوں اور عباسی بادشاہوں کی تمام بداعمالیاں اسلامی حکومت کے حساب میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اور تازہ مثال کے طور پر سعودی عرب کی تعلیمی و اقتصادی پستی اور اس کے بادشاہ اور شہزادوں کی عیاشیوں اور عیش پرستیوں کو اسلامی نظام حکومت اور دینداری کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ (صفحہ ۱۹۰-۱۸۶) جب بنیاد ہی سرتاپا غلط ہو، تو نتائج کیوں نہ غلط اور گمراہ کن ہوں؟

کتاب میں بعض مفید معلومات بھی ہیں۔ روٹی بھی ہیں امن ہے (الخبز ہو السلام) کے سلسلے میں مصر کی اقتصادی حالت سے متعلق بعض ایسی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں جن سے اس خطہ (ہند و پاکستان)

---

[1] مواطنون کو مصنف نے Nationals کے معنوں میں استعمال کیا ہے، جو لغت کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ اور رعایا کو مظلوم و مقہور غلاموں کے مفہوم میں لائے ہیں، جو اس لفظ پر ظلم ہے۔ ایک ازہری عالم عبدالمتعال صعیدی نے (جو خود بھی بہکے ہوئے ہیں) لفظ رعایا کے غلط استعمال پر مصنف کو سختی کے ساتھ ٹوکا ہے

کے باشندے عام طور پر ناواقف ہیں۔ زمین کی غیر فطری تقسیم (ص ۱۱۵-۱۱۶)، بندوبست اراضی کے ظالمانہ قوانین، (ص ۱۱۸-۱۱۹، ۱۳۹) اور ملازمین کی تنخواہوں میں حد درجہ تفاوت (ص ۱۳۴)، اور اس قسم کے دوسرے مسائل سے متعلق مفصل معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک یہ حالات قائم ہیں، صرف تشدد اور فوجی قوانین سے اشتراکیت کا سیلاب نہیں روکا جا سکتا۔

آخری باب میں عورتوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ حیرت انگیز ہے۔ مصر میں عورتوں کی تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثرات اس درجے کو پہنچ گئے ہیں کہ سمجھدار طبقے چیخ اٹھے ہیں۔ اور تو اور عورتوں کی جدید تعلیم اور بے پردگی کے حامی بھی بے حیائی کی اس رفتار سے گھبرا رہے ہیں۔ مگر ازہر کا یہ بگڑا ہوا شیخ اس پر بھی مطمئن نہیں۔ لے دے کر صرف پارلیمنٹ کی ممبری اور انتخاب کا حق عورتوں کو مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں حاصل نہیں۔ خوش قسمتی سے عرب ملکوں کے علماء اور اہل نظر اس بات پر متفق ہیں کہ عورتوں کو عام ملکی نظم ونسق میں دخیل نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے "نیل زادیوں" کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے باوجود اب تک وہاں عورتیں ووٹ اور ممبری کے "کارو بار" سے الگ ہیں۔ کتاب کے مصنف اس پر بہت نالاں ہیں۔ اور یہاں یہ بات دلچسپی کے ساتھ سنی جائے گی کہ مصنف نے عورتوں کی صلاحیت کار کے سلسلے میں سب سے بڑی اسلامی حکومت پاکستان کی بے پردہ خاتون، بیگم شائستہ اکرام اللہ سہروردیہ کو حجت کے طور پر پیش کیا ہے نیز پاکستانی عورتوں کو بے محابا اور بے جھجک پریڈ کے لباس میں دیکھ کر بھی بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا ہے: (ص ۲۱۱)

کتاب کا "تعارف" ذرا طویل ہو رہا ہے۔ آخر میں ایک بات اور سن لی جائے تو اچھا ہے۔ کتاب کی قیمت خاص طور پر بہت کم رکھی گئی ہے۔ اور ایک سال میں چار اڈیشن نکل چکے ہیں۔ نیز غیر ملکی عیسائی مشنریوں نے اس کی طباعت واشاعت میں خاص طور پر مدد کی ہے۔

(۲) مِنْ هُنَا نَعْلَم (ہم یہاں سے جانتے ہیں) مصنفہ محمد الغزالی۔ ۱۳۶ صفحے۔

۔ یہ خالد محمد خالد کی کتاب من ھُنا نبدأ کا جواب ہے۔ اس کے مصنف الاخوان المسلمون

کے سرگرم کارکن اور جوان صالح، شیخ محمد الغزالی ہیں۔ اصل کتاب کے برعکس، تردید انتہائی سنجیدہ اور علمی اندازِ بیان میں لکھی گئی ہے۔ اور شیخ خالد کے مغالطوں اور غلط بیانیوں کو متانت اور قوتِ استدلال کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے مصنف نے اسلامی نظام حکومت کو لیا ہے، جس کی دعوت ان کا مشن ہے اور جس کی راہ میں وہ قید و بند سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔ مصنف کے ذہنی سلجھاؤ کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے شروع ہی میں اسلامی دستور کی حیثیت اور اہمیت واضح کر دی ہے۔ نجد و یمن کی حکومتوں کو وہ اسلامی حکومت تسلیم نہیں کرتے، گو وہاں شرعی حدود کا نفاذ ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"حدود شرعیہ ہی کل اسلام نہیں، . . . . فوجداری اور مالی قوانین دستور کے فروع ہیں۔ پہلے دستور کی تعیین اور تحدید ہونی چاہیے۔ اگر دستور ہی اسلامی نہیں، تو پھر فروع کی کیا قیمت؟ جزیرۂ عرب میں شخصی استبداد کے سوا کوئی "دستور" نہیں۔ اور جب حاکم کی زبانِ حال وہ دعویٰ کر رہی ہو جو فرعون کی زبان مقال نے کیا تھا[1] تو پھر قانون اسلامی اور حدود کے نفاذ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔" (ص ۱۸-۱۷)

مصنف نے بڑی تفصیل سے اسلامی حکومت کے فرائض و واجبات گنائے ہیں اور دین و دنیا کی تقسیم کے اسباب و مفاسد پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اسلامی حکومت اور عیسائیوں کی تھیاکریسی (Theocracy) کا فرق بھی لائق مصنف سے پوشیدہ نہیں۔ (ص ۲۵)

اسلامی حکومت کی خصوصیات اور قومی حکومتوں کی خرابیوں کی تفصیل پورے ۶۶ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ مزید اقتباس دینا طوالت کا باعث ہوگا۔

اس کے بعد مصنف نے شیخ خالد کے محبوب و مرغوب موضوع پر گفتگو کی ہے۔ علماء کا مذاق اڑانے میں شیخ خالد کو بڑا لطف آتا ہے۔ وہ خود بھی ازہر کے سند یافتہ ہیں، شاید یہ احساس کمتری کا نتیجہ ہو۔ محمد الغزالی نے اس باب میں بے لاگ اور صاف باتیں کہی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ

[1] یعنی انا ربکم الاعلیٰ

مغربی مفکروں کے اقوال کی ضرورت کیا تھی؟ احادیث میں علماءِ سوء کے فتنوں اور فریب کاریوں کی صاف پیش گوئیاں موجود ہیں۔ علمائے اسلام کی تصنیفات میں پیشہ ور واعظوں اور دین کا کاروبار کرنے والوں (المتجرین بالدین) کے خلاف کیا کچھ نہیں کہا گیا ہے (ص۶۲-۶۷) شیخ خالد کی اس بات سے بھی الغزالی کو اتفاق ہے کہ اس وقت مصر میں دین کے نام نہاد ترجمان اور دینی انجمنوں اور درس گاہوں کے کرتا دھرتا دین کی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ اُن کے اپنے محدود تصورات ہیں، جن پر وہ خوش وخرم، ایک "وظیفہ خوار" کی طرح "شاہ" کو دعائیں دیا کرتے ہیں اُن میں سے بعض مشہور مذہبی انجمنوں (الجمعیات الدینیہ) کا ذکر کرتے ہوئے، الغزالی لکھتے ہیں:-

"ایک انجمن ہے، جو روزہ نماز پر قانع ہے۔ اس کے کارکنوں کو معاشرتی معاملات پر توجہ دلائیے تو جواب ملے گا ہم سیاسیات میں دخل نہیں دیتے۔ دین کے اس فہم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے فلسطین ہاتھ سے نکل گیا اور ان کے ہاتھوں میں جنبش تک نہ ہوئی۔ ایک دوسری شاندار انجمن ہے جو قبروں کی پرستش اور تقلید شخصی کے خلاف بر سر پیکار اور محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات کے پھیلانے میں سرگرم[1] ہے جب ان سے پوچھیے کہ زندوں کی عبادت (عبادۃ الاحیاء) اور خود ابن عبدالوہاب کے وطن میں "طواغیت" کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا کیسا ہے؟ تو لبوں پر مہرِ سکوت لگ جاتی ہے۔"

ص۷۳-۸۰،

یہ بحث ص۹۰ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد عورتوں کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے (ص۹۱-۱۰۹)

---

[1] اس انجمن کے ماہانہ آرگن (الہدیٰ النبوی) کے نگران اعلیٰ اور مصر کے سب سے بڑے سلفی عالم اور محقق شیخ احمد محمد شاکر (جن کی تحریریں نظامِ اسلامی کی حمایت میں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں) نے تو گذشتہ دور استبداد میں حد ہی کر دی۔ یعنی الاخوان المسلمون کے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ العیاذ باللہ۔ اللہ کے دین کی راہ میں جان دینے والے کافر اور گھروں میں بیٹھ کر کتابوں کی ورق گردانی کرنے والے اسلام کے علمبردار۔ ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اِس سلسلے میں صرف ایک چیز قابلِ ذکر ہے۔ مصنف چہرے پر نقاب ڈالنا عورت کے لیے ضروری نہیں خیال کرتے اور اس پر انہیں اصرار ہے (ص۱۰۵)۔ کتاب کی اشاعت کے بعد شبابِ سیدنا محمدؐ[1] والوں سے ان کی بحث بھی ہو چکی ہے۔

کتاب کا آخری اور چوتھا باب اسلام اور اشتراکیت (ص۱۳۳-۱۱۲) خوب ہے۔ شیخ خالد نے صدقہ اور زکوٰۃ کا مذاق اڑایا تھا۔ مصنف نے نہایت معقول اور مدلل طریقے پر صدقہ اور زکوٰۃ کی اہمیت واضح کی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقرباء (بنو ہاشم) کے لیے زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا ہے۔ اس کی عجیب و غریب توجیہیں کی جاتی ہیں۔ بعض لوگ اسے نسبی برتری پر محمول کرتے ہیں۔ شیخ خالد نے زکوٰۃ کے مال کی حقارت اِس کی وجہ قرار دی ہے مگر مصنف نے صحیح طور پر لکھا ہے کہ رسول کریمؐ نے داعی کی حیثیت سے ایثار سے کام لیا اور اپنے خاندان والوں کو ملکی آمدنی کے ایک بڑے ذریعے سے محروم کر دیا۔ یہ داعی کی خصوصیات ہیں۔ آخر نبی کی ذاتی جائداد بھی تو میراث نہیں بنتی۔ زکوٰۃ دین کا ایک اہم رکن ہے۔ اگر اس مال میں آلِ رسول کا حصہ ہوتا، تو کہنے والوں کو موقع ملتا۔ قرآنِ کریم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے لوثی اور پاک دامنی پر بار بار زور دیا ہے۔ زکوٰۃ کے مال سے بنو ہاشم کو محروم کرنا بھی اسی بے لوثی کی ایک مثال ہے۔ اس باب کے آخر میں مصنف نے ہمارے عربی رسالوں کا بھی ذکر کیا ہے:-

"ایک مہینہ ہُوا، مولانا مودودی (رئیس جماعت اسلامی پاکستان) کے علمی رسالے مجھے ملے۔ میں نے انہیں دو دو تین تین بار (مثنیٰ و ثلاث) پڑھا۔ میری حیرت و تعجب کی انتہا نہ رہی جب ہم نے اپنے ہندی بھائیوں کو اسلوب بیان، تدابیر، اور حل، سب میں اپنے سے بہت قریب بلکہ بالکل موافق پایا۔"

---

[1] مصر کی ایک مذہبی انجمن، جو صرف عورتوں کی بے حیائی اور بے پردگی کے خلاف مصروفِ جہاد ہے۔

اس باب میں ہمیں مصنف کی اصطلاح "الاشتراکیۃ الاسلامیہ" (اسلامی سوشلزم) سے اختلاف ہے۔ مصر وشام میں ہمارے ہم خیال دوستوں نے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح تقریباً قبول کر لی ہے۔ وہ شیوعیہ (کمیونزم) سے تو بہت برہم ہیں، مگر اظہار مدعا اور تفہیم عام کے لیے اسلامی اشتراکیت (اسلامی سوشلزم) استعمال کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ہم انشاء اللہ انہیں اس طرف بار بار توجہ دلائیں گے۔ اسی طرح ایک جگہ مصنف نے جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ، احمد عرابی اور عبدالرحمٰن الکواکبی کو اسلامی حکومت کے داعیوں میں شمار کیا ہے (ص۴۸)۔ یہ صحیح نہیں ہے[1]۔ سید جمال الدین مسلمان حکومتوں کا سیاسی اتحاد اور مغربی طاقتوں کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ محمد عبدہٗ کچھ دنوں تو اپنے استاذ کے ساتھ چلے، پھر ایک تعلیمی ومعاشرتی مصلح ہو کر رہ گئے۔ کہیں کہیں تو محمد عبدہٗ ہمارے ہاں کے سرسید، امیر علی اور چراغ علی کی صف میں آجاتے ہیں۔ احمد عرابی ایک فوجی لیڈر تھے۔ وہ نہ عالم تھے نہ مصلح۔ عبدالرحمٰن الکواکبی کے سیاسی اور دینی مصلح ہونے میں شک نہیں، مگر اسلامی حکومت کا داعی کہنا انہیں بھی مشکل ہے۔

بس یہی دو چیزیں کتاب کے فکری نظام میں ٹھیک نہیں بیٹھتیں۔ انشاء اللہ ہم انہیں اس طرف توجہ دلائیں گے۔

(۳) **الاسلام والاوضاع الاقتصادیۃ** (اسلام اور معاشی تشکیلات) تالیف محمد الغزالی: ۱۱۶ صفحے (دوسرا اڈیشن)

اقتصادی نظام اور اس کی مختلف تشکیلات کے باب میں دین کا موقف کیا ہے؟ یہ ہے کتاب کا موضوع۔

"میں نے صرف دین کے نصوص اور اس کے مآخذ پر اعتماد کیا ہے۔ تقابلی مطالعہ اور دوسرے نظاموں سے موازنہ کی کوشش نہیں کی گئی۔ مجھے نہ اس سے بحث ہے اور نہ میرے پاس اسکے وسائل ہی ہیں۔ اس کتاب کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ

[1] الاخوان المسلمون کے اکثر لکھنے والے اس فرق کو محسوس کرتے ہیں۔ احمد انس الحجاجی نے اپنے ایک رسالہ "رجل الساعۃ" (وقت کا آدمی) میں اسے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مختلف اقتصادی افکار میں اسلام کا موقف کیا ہے ۔" (صلا)

مصنف کے الفاظ میں یہ کتاب کا مرکزی مضمون ہے ۔ اُن کو اس بات کا بڑا دردا ور شدید احساس ہے کہ سرمایہ داری اور کمیونزم کی رسہ کشی کے درمیان اسلام گم ہو کر رہ گیا ہے ۔ دین کے علم بردار ایسے جامد اور بے خبر ہیں کہ وہ بے سمجھی میں یا جان بوجھ کر سرمایہ داروں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں ۔ اس لیے دین کی تعلیمات کو صاف اور منقح طور پر پیش کرنے کی ضرورت ہے ۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ محمد الغزالی اور ان کے رفقاء مقدور بھر اس کام کو کر رہے ہیں ۔

مؤلف کے خیال میں قوموں کی ترقی، اخلاقی برتری اور عام اصلاح میں اقتصادی خوشحالی کا بڑا دخل ہے ۔" مصنف کی رائے میں یہ مارکسی نظریۂ تاریخ نہیں ۔ وہ کہتے ہیں :-

"ہم معنوی اور روحانی اقدار کی اہمیت و تاثیر کے منکر نہیں ۔ لیکن حقائق سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فقر و فاقہ کی ماری ہوئی سوسائٹی میں بداخلاقیوں کو پھیلنے اور سر اٹھانے کا خوب موقع ملتا ہے ۔ احادیث میں اس طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے ۔" (صلا)

یہی وجہ ہے کہ مؤلف اور ان کے رفقا کے پروگرام میں اقتصادی اصلاح کو نمایاں حیثیت حاصل ہے ۔ اور غالباً اسی سبب سے "اخوان" کو "کمیونسٹ" ہونے کا الزام بھی دیا گیا ہے ۔ جناب "رائیٹر" بھی کبھی کبھی اس طرح کی کرم فرمائی کر دیا کرتے ہیں ۔

مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور اخلاقی پستی کے اسباب پر بحث کرنے کے بعد مصنف نے علاج کی طرف توجہ کی ہے اور اس سلسلے میں بڑی سنجیدہ اور معقول باتیں کہی ہیں جن سے ان کی سوجھ بوجھ اور فکری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اتفاق سے وہ مسائل جن کی طرف مؤلف نے خاص طور پر توجہ کی ہے ہمارے ہاں بھی اُسی طرح اہم اور زیر غور ہیں جس طرح مصر میں، نیز علاج کے لیے بھی ہم اور وہ ایک ہی شفاخانہ (کتاب و سنت) کی طرف توجہ کرتے ہیں، اس لیے طبعی طور پر تشخیص میں بڑی حد تک توارد اور یکسانی پائی جاتی ہے ۔ تاہم کہیں

کہیں کہیں نسخوں میں جزئی اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مولف نے سونے اور چاندی کے نصاب میں یکسانی پر بہت زور دیا ہے (صفحہ ۹۵)۔ اسی طرح وہ طبیب، کاریگر، انجینئر اور دوسرے پیشہ ور طبقوں کی آمدنیوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کے حامی ہیں (صفحہ ۹۳)۔ مصنف کا بیان ملاحظہ ہو:

"اسلام میں زکوٰۃ کہیں جمع شدہ مال پر عائد کی گئی ہے اور کہیں آمدنیوں پر۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جس شخص کی آمدنی اُس کاشتکار کے برابر ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، اُس پر بھی اسی تناسب سے زکوٰۃ عائد ہونی چاہیے۔

اسلامی نظام میں یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ پانچ ایکڑ زمین کے مالک کسان پر تو زکوٰۃ واجب ہو اور ایسی عمارتوں کے مالک آزاد چھوڑ دیے جائیں جن کی آمدنی پچاس ایکڑ زمین کی آمدنی کے برابر ہو۔ یا اُن طبیبوں سے کچھ نہ لیا جائے جو ایک دن میں اتنا کما لیتے ہوں جو غریب کسان اپنی پانچ ایکڑ زمین سے عمر بھر میں بھی نہیں حاصل کر سکتا۔ اس لیے ان سب پر زکوٰۃ عائد ہونی چاہیے۔" (صفحہ ۹۳-۹۴)

لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ مؤلف اور ان کے رفقا ان تجویزوں کو قطعی نہیں قرار دیتے یہ تجویزیں بہرحال تجویزیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ:

"یہ ایک آدمی کے سوچنے کی بات نہیں۔ علماء اور اہل نظر کے تعاون سے کوئی چیز طے ہو سکتی ہے۔" (صفحہ ۹۴)

مصر کی معاشی اصلاح کے سلسلے میں مؤلف نے اور چند تجویزیں پیش کی ہیں۔ ان سے بھی ان کے طرزِ فکر کا اندازہ ہوگا:۔

"(۱) عام ضرورت کی چیزوں کو قومی ملکیت قرار دینا۔ کمپنیوں کی اجارہ داری کو ختم کرنا اور کسی فردِ واحد کو "مرافقِ عامہ" میں تصرف کا حق نہ دینا۔

(۲) بڑی زمینداریوں کو کم کرنا اور زرعی مزدوروں کو تدریجی طور پر زمینوں کا مالک بنانا

(۳) جمع شدہ دولت پر ٹیکس عائد کرنا۔

(۴) غیر ملکیوں سے زمین واپس لینا۔

(۵) مزدوروں کی مزدوری کو کارخانوں کے منافع کے ساتھ اس طرح وابستہ کرنا کہ عام مزدوری کے علاوہ، منافع میں بھی کچھ اُن کا حصہ ہو۔

(۶) میراث پر متزاید محصول (ضریبۃ تصاعدیہ Progressive rate of taxation) عائد کرنا اور منشاء قرآنی کے مطابق اسے مفاد عامہ کے کاموں میں خرچ کرنا۔"

یہ تجویزیں شاید کچھ سخت اور انتہاپسندانہ معلوم ہوں، مگر مصر کی موجودہ معاشی صورت حال کا یہ لازمی ردعمل ہے۔ شاید پاکستان میں سندھ کے علاوہ کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں امیر و غریب کے درمیان مصر جیسا معاشی تفاوت ہو۔ مصر میں صرف اہرام ہی نہیں۔ یہاں اور بھی عجائبات ہیں۔ فراعنہ کی زمین صحیح معنوں میں مجموعۂ اضداد ہے۔

اِن سب کے بعد مصنف نے کتاب کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے اُن کے ذہن کی صفائی اور دماغی سلجھاؤ کا پتہ چلتا ہے:

"سیاسی استبداد، سرمایہ دارانہ ظلم اور مصنوعی دینداری، مشرق کی پرانی بیماریاں ہیں ——— اور اس سے بھی بڑی پستی یہ ہے کہ ان "بیماریوں" کی پرورش اور پرداخت کے لیے غریب اسلام کو استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔

بعض مذہبی جماعتوں کے خیال میں دین صرف ایمان بالغیب، روزِ آخر پر یقین اور چند عبادتوں کا نام ہے۔ ان کے ساتھ کچھ شخصی قوانین اور انفرادی احکام کا پیوند بھی لگا لیا جاتا ہے۔ یہ جماعتیں اسی تنگ دائرے میں دین کی خدمت کرنا چاہتی ہیں سیاسی ڈکٹیٹرشپ اور اقتصادی سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ اگر یہ اپنے مزعومہ مقصد میں کامیاب بھی ہوں، تو ان کی کامیابی و ناکامی دونوں برابر ہیں۔ جب تک برسرِ اقتدار فرعونیت (الفرعونیۃ الحاکمۃ) اور سرمایہ دارانہ قارونیت (القارونیۃ الکانزۃ) اللہ کی زمین میں فساد برپا کر رہی ہیں اور نسل نوعِ آدم کا خون بہا رہی ہیں، تعلیمات اسلام کی حیثیت

نقش بر آب سے زیادہ نہیں ہوگی۔“ (ص ۱۱)

کتاب میں اور بھی مفید بحثیں ہیں۔ ایک مصنف کے تمام افکار و خیالات سے کسی تبصرہ نگار کا متفق ہونا بہت مشکل ہے، پھر بھی مجموعی حیثیت سے کتاب جدید مصری لٹریچر میں خوش آئند اضافہ ہے۔

(۴) الاسلام المفتری علیہ بین الشیوعیین والراسمالیین (کمیونسٹوں اور سرمایہ داروں کی رسہ کشی میں بدنام اسلام کا موقف) تالیف محمد الغزالی۔ ۱۷۶ صفحے۔

یہ شیخ محمد الغزالی کی تازہ تصنیف ہے۔ موضوع بحث پہلی کتاب سے ملتا جلتا ہے۔ مصنف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام سرمایہ داری اور ”شیوعیت“ (کمیونزم) دونوں کا دشمن ہے اور یہ دونوں بھی اسلام اور دین کے یکساں دشمن اور مخالف ہیں۔ کتاب میں چھ باب ہیں:

(۱) تمدن کی رفتار و ارتقاء پر الحاد و ایمان کی کشمکش کا اثر (ص ۲۶-۱۱)

(۲) اخوت عامہ کے ارکان (ص ۶۵-۲۷)

(۳) اسلام میں اجتماعی عدل کے نمونے (ص ۸۸-۶۶)

(۴) اسلامی قانون، نظام معیشت کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتا ہے (ص ۱۳۲-۸۹)

(۵) اسلام کے سرکاری ترجمان (ص ۱۵۲-۱۳۳)

(۶) درس عبرت (ص ۱۷۳-۱۵۶)

پہلی چیز جو کتاب کی ہر ہر سطر میں نمایاں نظر آتی ہے، وہ ایک داعی کی تڑپ ہے۔ مثال کے طور پر پہلے باب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”یورپ میں دین اپنا آزاد تشخص کھو چکا ہے۔ مختلف کج فہمیوں نے اسے بے بس کر رکھا ہے۔ یہودیت، انتہا پسند صیہونیت کی شکل اختیار کر چکی ہے اور مسیحیت کی حیثیت شہنشاہیت کے آلۂ کار سے زیادہ نہیں۔ اب ان لوگوں کی تمنا یہ ہے کہ اسلام بھی اپنا تشخص اور اپنی خصوصیات کھو کر کسی دوسرے نظام فکر کی آغوش میں زندگی بسر کرنے

پر قانع ہو جائے، اور پھر سرکش صیہونیت اور ظالم امپریلزم (جو پرانی "صلیبیت" کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے) کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بھی بڑھائے۔ مگر یہ ناممکن ہے۔ مقابلہ اور جدوجہد، اس دین کی فطرت ہے۔ مسلمانوں پر نہیں، بلکہ پوری دنیا پر ظلم ہو گا اگر فکر و عمل کی دنیا سے اُس امت کو الگ کر دیا جائے جو کتاب و سنت پر عمل پیرا، اس کا احترام کرنے والی اور زندگی کی تمام مشکلات میں اس کی طرف رجوع کرنے والی ہے، جس کے لئے دینداری عار نہیں، بلکہ عزت کا باعث ہے، اور ایمان باللہ اور روز آخر پر یقین جس کے لیے باعث اطمینان و سکون ہی نہیں، سرمایۂ سعادت اور توشۂ آخرت بھی ہے۔ یورپ کے لیے ہماری یہ پوزیشن ناقابلِ قبول ہے تو ہم بھی اس سے کم پر راضی نہیں۔ دیکھیں، اس کشمکش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ (اِنَّ اُوْرُبَّا تَاْبٰی عَلَیْنَا ذٰلِكَ، وَنَحْنُ نَاْبٰی اِلَّا ذٰلِكَ، وَسَنَرٰی مَا یَكُوْنُ" (ص ۲۱)

مصنف نے اپنی دوسری کتابوں کی طرح یہاں بھی اس حقیقت پر بہت زور دیا ہے کہ کمیونزم کا مقابلہ صرف فتووں سے نہیں ہو سکتا۔ جب تک ملک کا معاشی توازن درست نہیں ہو گا اور اسلامی عدل کی برکتوں سے قوم متمتع نہیں ہو گی، تمام تشدد اور رکاوٹوں کے باوجود کمیونزم کی فتنہ سامانیاں فساد پھیلاتی رہیں گی۔

"اسلام میں اجتماعی عدل کے نمونے" پیش کرتے ہوئے مصنف نے عمرؓ فاروق اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے دورِ خلافت کی کافی مثالیں دی ہیں۔ ساتھ ساتھ حضرت ابوذر غفاریؓ کے نظریۂ مال کی پوری تائید کرتے ہوئے اس پر بڑی مفصل بحث کی ہے۔ بنو امیہ اور امیر معاویہؓ سے قدرتی طور پر وہ خوش نہیں ہیں۔ حضرت ابوذرؓ کی شدت بھی اصل میں امیر معاویہ ہی کی بے اصولیوں کی پیداوار تھی، کعب احبار جیسے لوگوں کے فتووں نے بھی آگ پر تیل کا کام دیا۔ حضرت ابوذرؓ کے باب میں حضرت عثمانؓ کی شدت کو بھی مصنف صحیح نہیں خیال کرتے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت عثمانؓ غیب جانتے ہوتے اور انہیں معاویہ کی ان کارروائیوں کی

خبر ہوتی جو وہ اپنے خاندان کے مستقبل کے لیے کر رہے تھے --- اگر انہیں ذرا بھی اس کا اندازہ ہوتا تو وہ سابقین اولین میں سے ایک بے لوث اور پاکباز صحابی کے ساتھ ایسا ناروا سلوک نہ کرتے (ص۶۰)

ازہر کے ایک فتوے کی بھی مؤلف نے پر زور تردید کی ہے۔ فتوے کا خلاصہ یہ ہے کہ "زکوٰۃ اور خراج وغیرہ کے علاوہ مال پر اور کوئی حق واجب نہیں" اولاً تو یہ بات صحیح نہیں۔ دوسرے اس سے مفاد پسند طبقوں کی حمایت مقصود تھی۔ مصر کی اکثر جاگیریں غصب اور حرام طریقوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ اجارہ کے قوانین انتہائی ظالمانہ ہیں۔ کسانوں کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں۔ ان حالات میں اگر حکومت مفاد عامہ کے پیش نظر کوئی ٹیکس عاید کرنا چاہے تو اسے ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ اہل فتویٰ کا فرض یہ ہے کہ وہ ماحول اور پس منظر کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیں اور سرمایہ داروں کے ناشائستہ آلۂ کار بننے سے بچنے کی کوشش کریں۔ مصنف نے مصری جاگیرداروں کے متعلق ایک لطیف بات اور کہی ہے "جناب مفتی کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ زکوٰۃ نہ ادا کرنے پر نصف مال کی ضبطی کا حکم صادر فرمایا تھا۔ یہاں ہمارے مالدار طبقوں نے تو اپنی زندگی میں ایک پائی بھی کسی فقیر کو نہیں دی۔ ان کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ کیا یہی انصاف ہے۔ ان ظالموں کے ظلم کی پردہ پوشی کی جائے اور فاقہ مست، کسانوں کے سامنے "تقدیر" اور "محبوبیت" پر خطبہ کہا جائے"؟ (ص۱۴۲)

کتاب میں اس طرح کی اچھی اور مفید بحثیں اور بھی ہیں۔ مصنف کا انداز فکر واضح۔ اور طرز بیان سلجھا ہوا ہے۔ زبان بھی اچھی اور عالمانہ ہے کسی مؤلف کے ہر ہر حرف سے تو اتفاق مشکل ہے، البتہ ان کے عام فکری رجحان سے ہمیں پورا اتفاق ہے اور ہم ان کی کتابوں کو عربستان کے لیے فال نیک سمجھتے ہیں۔

البتہ ہمیں ان کی اصطلاح اسلامی سوشلزم (الاشتراکیۃ الاسلامیہ) سے سخت اختلاف ہے۔ گو ان کے بیان کے مطابق تفہیم عام کے لیے یہ اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔ مگر اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور ان کے ایک آدھ بیان سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ سوشلزم کو اچھی طرح سمجھتے بھی نہیں ہیں۔ (ص۱۴۴)

(باقی)

رسائل و مسائل

اسلامی عقائد اور موجودہ مسلمان فرقے

مجدد و مہدی کے خطابات کا استعمال

سوال:- میں نے آپ کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور آپ کا عقیدہ پڑھ کر ایمان اور بڑھا۔ اب میں یہ کہتا ہوں کہ جو شخص اس عقیدے کا اعلان کرے وہ مسلمان ہے، خواہ کسی اسلامی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ میں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میری یہ رائے صحیح ہے؟ میں نے ترجمان القرآن میں شیعہ گروہ کے بارے میں آپ کا جواب پڑھا ہے کہ ہم نے اپنا عقیدہ بتا دیا ہے اور جو کوئی اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہو وہ مسلمان ہے۔ بالفاظ دیگر ایک شخص شیعہ ہو یا سُنّی، اس عقیدہ کو قبول کرنے کی صورت میں اسے مسلمان شمار ہونا چاہیے۔ میرا خیال یہ ہے کہ موجودہ اسلامی فرقوں میں سے کوئی بھی ایسا فرقہ نہیں جو اس پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں سب کلمہ گو آپ کے نزدیک اسلامی معاشرے میں داخل ہیں۔

اس کے بعد میں مزید یہ عرض کرتا ہوں کہ جماعت اسلامی کا ممبر صرف مسلمان بن سکتا ہے جو اس کے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہو، غیر مسلم اس میں نہیں آسکتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر مسلم مثلاً عیسائی، ہندو وغیرہ کو پہلے مسلمان بننا ہے اور اسلامی معاشرہ کے محل میں جس کا دروازہ صرف ایک کلمہ ہی کا دروازہ ہے۔ پہلے کلمہ پڑھ کر ہی اندر آنا ہے۔ اس کے بعد باقی ارکان پر عمل کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ان باتوں سے میری یہ غرض ہے کہ آپ اپنی تحریروں میں جہاں "مسلمانوں کے مسلمہ فرقے" کے الفاظ لکھتے ہیں[1] وہاں "تمام موجودہ اسلامی فرقے" کے الفاظ لکھا کریں۔ کیونکہ مسلمہ

[1] یہ اصطلاح علماء کے ایک مشترک بیان میں استعمال ہوئی ہے نہ کہ ہماری تحریروں میں۔

فرقوں" کے الفاظ سے یہ پہلو نکلتا ہے کہ آپ کے نزدیک بعض فرقے مسلّم نہیں ہیں۔ مثلاً شیعہ اور قادیانی وغیرہ۔ حالانکہ وہ آپ کے محولہ بالا عقیدہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

مجدد کے لیے دعویٰ کرنا ضروری نہیں۔ لوگ اس کے کام سے اس کو پہچانیں گے۔ امام مہدی بھی ایک مجدد کامل ہوگا جو تمام علوم ظاہری و باطنی سے آگاہ ہوگا۔ اب صدی کا سرا آچکا ہے، اور اس وقت اُن تمام علامات کو دیکھا جائے تو وہ آپ میں پائی جاتی ہیں۔ میں نے پچھلے مجددین کے کارنامے دیکھے ہیں۔ بعضوں نے دعویٰ کیا اور بعضوں نے نہ کیا، مگر وہ مجدد تھے اور لوگوں نے ان کو مجدد کہا اور انہوں نے انکار نہیں کیا۔ اب مجھے بتائیں کہ میں ان تمام علامات کو دیکھ کر آپ کو مجدد وقت اور مہدئ زماں نہ کہوں تو گنہگار ہوں گا۔ جب میں نے پہچان لیا اور خدا نے مجھے روشنی دی تو میں کیوں انکار کروں اور کیوں نہ اپنے خیالات کو پھیلاؤں کہ مجدد وقت پیدا ہو چکا ہے۔ آخر امام وقت کو نہ پہچاننا جہالت کی موت ہے۔ میں آپ سے اجازت مانگتا ہوں کہ مجھے اپنے خیالات کو پھیلانے کی اجازت دیں۔ جو کوئی آپ کو پہچان کر مانے گا وہ دنیا کے کسی فتنہ سے مرعوب نہیں ہوگا کیونکہ اب وقت آگیا ہے کہ علماء سوء اٹھیں اور مجدد وقت کے خلاف فتوے شائع کریں جو ایمان کے کمزور ہوں گے وہ بھاگ جائیں گے اور ہماری جماعت خالص اسلامی جماعت ہوگی[1]۔

اسلامی پنچایت کے متعلق میری یہ تجویز ہے کہ قوم کی تنظیم اس طرح کی جائے کہ گاؤں کے ایک محلہ سے اس کا آغاز ہو۔ دس آدمی مل کر اپنا امیر چنیں جس کی ایمانداری، اصابت رائے اور تقویٰ پر سب سے زیادہ آدمیوں کا یقین ہو، جو ان سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو۔ پھر یہ دس امیر مل کر اسی اصول پر اپنا ایک صدر چنیں، علیٰ ہٰذا القیاس یہ سلسلہ اوپر تک ارتقاء کرتا جائے۔

جواب: ہم نے جماعت اسلامی کے دستور میں اسلامی عقائد کا جو خلاصہ دیا ہے ہمارے نزدیک اس کا ماننے والا ہر شخص مسلمان ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اسے کون مانتا ہے اور کون

[1] واضح رہے کہ جناب سائل خود جماعت اسلامی کے رکن نہیں ہیں۔ (نائب مدیر)

نہیں مانتا۔ اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اسے مختلف گروہوں کے سامنے پیش کیجیے اور پوچھ لیجیے کہ آپ اسے مانتے ہیں یا نہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو لوگ اس کے کسی جز کو نہ مانتے ہوں ہم ان کی تکفیر کرتے ہیں۔ تکفیر کرنے کے بجائے ہم انہیں ایسی گمراہی میں مبتلا سمجھتے ہیں جو ان کو کفر و اسلام کی درمیانی سرحد پر لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ ان میں سے بعض کا تو ایک پاؤں سرحد کے باہر ہے اور ایک سرحد کے اندر۔ اور بعض بالکل سرحد کے کنارے لگے کھڑے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ مختلف فرقوں کے بارے میں ہماری یہ رائے اپنی جگہ سمجھنے کے لیے ہے تاکہ ہم ان کی پوزیشن صحیح طور پر سمجھ کر ان کے ساتھ اپنا رویہ متعین کریں۔ یہ رائے اعلان کرتے پھرنے اور جھگڑنے کے لیے نہیں ہے۔ ہم جھگڑوں اور مناظروں اور فتوے بازیوں کے بجائے خلق اللہ کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور بگڑے ہوئے لوگوں کے بگاڑ کی تشخیص صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا علاج ٹھیک طریقہ سے کیا جا سکے۔ نہ اس غرض سے کہ انہیں کاٹ پھینکا جائے۔

مجدد اور مہدی کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے ہرگز اتفاق نہیں ہے۔ اور نہ میں آپ کو یا کسی شخص کو یہ اجازت دے سکتا ہوں کہ آپ میرے متعلق اس قسم کا کوئی خیال ظاہر کریں اور اسے لوگوں میں پھیلائیں۔ بلکہ میری آپ سے یہ التجا ہے کہ براہ کرم اس خیال کو اپنے دل سے بھی نکال دیجیے۔ اول تو حقیقت میں مجدد اور مہدی وہ ہے جو خدا کے آخری فیصلے میں مجدد یا مہدی قرار پائے، نہ کہ وہ جو خود دعویٰ کرے یا جسے لوگ ایسا سمجھیں۔ دوسرے یہ کہ اس طرح کسی خاص اصطلاح اور خاص نام سے کسی شخص کی پوزیشن مشخص کرنے کی فی الواقع کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص راہ راست پر ہے تو بس اسے راست رو سمجھیے، کہیے اور اس کا ساتھ دیجیے۔ آخر ضرورت کیا پڑی ہے کہ آپ اس کے لیے القاب اور خطابات تجویز کریں، اور وہ بھی ایسے جن سے خواہ مخواہ فتنہ رونما ہو؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے

آج تک کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں کس لقب کا مستحق ہوں، یا دین میں میرا مرتبہ اور منصب کیا ہے۔ مجھے تو بس یہ فکر ہے کہ کسی طرح خدا کے دین کی کوئی ایسی خدمت کر جاؤں جو اللہ کے ہاں میرے گناہوں کی مغفرت کے لیے کافی ہو سکے اور میرا حشر عباد الطاغوت کے بجائے عباد الرحمن کے ساتھ ہو سکے۔ اس سے زیادہ جو کچھ میرا مالک مجھے دے اس کا فضل ہے۔ ورنہ میرے لیے تو بس یہی بڑی کامیابی ہے۔ بڑے سے بڑا منصب جس کی مجھے تمنا ہے وہ مومن قانت ہونے کا منصب ہے اور وہ بھی خالق کی نگاہ میں نہ کہ محض خلق کی نگاہ میں۔ خلق کی بڑی مہربانی ہو گی اگر وہ میرے لیے کوئی منصب تجویز کرنے کے بجائے خدمتِ دین میں میرا ہاتھ بٹائے، یا کم از کم روڑے اٹکانے اور فتنوں میں اُلجھانے سے باز رہ جائے۔

اسلامی پنچایت کے بارے میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے اپنے حال کے اجلاس میں جو نقشہ تجویز کیا ہے وہ ہمارے نزدیک سردست موزوں ترین ہے۔ الّا یہ کہ آگے چل کر تجربہ سے اس کے اندر کوئی خامی نظر آئے۔ بہر حال اس وقت ہم اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

تصوف کا فسادِ مزاج

سوال:۔ رسالہ ترجمان القرآن میں اس قسم کے دوسرے سوالات کے جوابات پڑھنے اور خاص کر مولانا حکیم عبدالرشید صاحب کے مضمون کا جواب پڑھنے کے بعد میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ زیادہ اُلجھنے اور صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن پھر بھی اگر دفع شر کے خیال سے بعض حضرات کی غلط فہمیاں دور کرنے کی غرض سے آپ اتہامات کی تردید کر دیا کریں تو بہتر ہو گا۔

مولانا امین احسن صاحب نے جو اپنی مضمون میں تصوف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے

اگرچہ عام صوفیاء اور عام مروجہ تصوف کے متعلق شاید یہ درست ہو لیکن حضرت گنگوہیؒ یا حضرت تھانویؒ یا اس سلسلہ کے دوسرے بزرگوں کے ہاں تصوف جس شکل و صورت میں پیش کیا گیا ہے اس کے متعلق اتنے تیز الفاظ استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ حاشا و کلا میں گروہی عصبیت کی بنا پر یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ بلکہ جہاں تک میں نے ان حضرات کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، انہوں نے بڑی شدومد سے بار بار یہ سمجھایا ہے کہ اصل تصوف صرف اطاعت خدا و رسول ہے۔ یہ طریقے محض تدبیریں ہیں۔ یہ وسائل ہیں مقاصد نہیں۔ ان میں کمی بیشی، تبدیلی کی جا سکتی ہے، اور وہ حسب ضرورت حالات و اشخاص کے اعتبار سے تبدیلیاں کرتے بھی رہے ہیں۔ مولانا عبدالباری ندوی کی نئی مطبوعہ کتاب "تجدید تصوف و سلوک" میں یہ سارے مباحث تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ تنقید کرتے وقت عبارت کچھ اس انداز کی ہونی چاہیے کہ مطلقاً تمام صوفیائے کرام اس کی لپیٹ میں نہ آسکیں۔ کیونکہ اس طرح کے عام الفاظ کو لے کر شرارت پسند غلط پروپیگنڈا کرتے ہیں اور پھر معتقدین و مریدین کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اگر پہلے سے احتیاط برتی جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا؟

آپ سے ایک استفسار کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے صوبہ میں اب ووٹروں کی فہرستیں بن رہی ہیں۔ میں اپنا اور خاندان کے دوسرے مردوں کا نام تو بہر حال درج کرا دوں گا عورتوں کے نام بھی درج کیے جا رہے ہیں۔ میں خود تو اپنے طور سے بہ حیثیت مسئلہ یہ سمجھتا ہوں کہ عورتوں کو ووٹ ڈالنے کے قضیہ میں شامل کرنا درست نہیں۔ اور خاص کر موجودہ ماحول میں تو عورتوں کے ووٹ ڈالنے اور ووٹ کے لیے جانے کو ناجائز سمجھتا ہوں پنجاب میں میں نے خود اپنی آنکھوں جو کچھ دیکھا ہے اس کی بنا پر اتنا تو مجھے وثوق کامل ہے کہ موجودہ ماحول میں عورت کا ووٹ ڈالنے کے لیے نکلنا گناہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ووٹروں کی فہرست میں عورتوں کے نام درج ہی نہ ہوں اور اپنے خاندان کی عورتوں کے

نام درج نہ ہونے دونگا۔ مگر بعض حضرات کہتے ہیں کہ نام لکھ دیئے جائیں تاکہ اس سے یہ تو معلوم ہو سکے کہ اس قصبہ میں اتنے ووٹر ہیں۔ کیونکہ اس پر حلقہ کے حدود متعین کیے جائیں گے اور نام درج نہ کرنے سے مجموعی علاقہ اور قصبہ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ پھر اگر کوئی ووٹ نہ دینا چاہے تو اس وقت نہ جائے، عورت گھر بیٹھی رہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر نام درج ہو گیا تو اگر وہ عورت خود گھر میں بیٹھی رہے تو ہمارے یاران شاطر جعلی ووٹ بھگتانے کے بھی تو ماہر ہیں، کسی اور کو اس کی جگہ بھیج دیں گے۔ الغرض آپ منقح طور سے فرمائیے کہ میں اس بارے میں کیا رویہ اختیار کروں، تاکہ خود بھی عمل کروں اور اپنے حلقۂ احباب و متعلقین میں بھی اس کے مطابق کام شروع کروں۔

جواب: تصوف کے متعلق جہاں تک مولانا امین احسن صاحب کے مضمون کو میں نے دیکھا ہے، اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی زد تمام صوفیا پر پڑتی ہو۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ مروج تصوف ہی کے متعلق لکھا ہے۔ لیکن میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ تصوف کے جو پاکیزہ ترین سلسلے کہے جا سکتے ہیں، جن کو وقت کے بڑے بڑے صاحب نظر علماء نے بدعات سے پاک کرنے اور شریعت کے مطابق بنانے کی انتہائی کوشش کی ہے، وہ بھی بعض ان خرابیوں سے محفوظ نہیں رہ سکے ہیں جو تصوف کی فطرت میں پیوست ہو کر رہ گئی ہیں۔ مجھ سے مولانا حسین احمد صاحب کے ایک مرید نے جو ریلوے گارڈ تھے، مولانا کے زمانۂ اسیری میں ایک دفعہ کہا کہ نہ معلوم کیا بات ہے جو مولانا جیل میں بیٹھے ہوئے ہیں، ورنہ وہ جب چاہیں باہر آسکتے ہیں۔ انہیں کون قید رکھ سکتا ہے، پھر انہوں نے چپکے سے یہ راز کی بات مجھے بتائی کہ اب بھی مولانا وقتاً فوقتاً باہر آکر اپنا کام کر جایا کرتے ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب کے ایک مرید، بلکہ صاحب اجازت خلیفہ، جو متوسط درجہ سے کچھ زیادہ ہی اونچے درجہ کے عالم ہیں، جماعت اسلامی سے حرف بحرف متفق تھے۔ مجھ سے خود انہوں نے متعدد مرتبہ اعتراف کیا کہ اپنے علم کی حد تک میں اس تحریک کو سراسر حق پاتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود وہ صرف اس لیے جماعت سے الگ رہے اور آج تک الگ ہیں کہ "حضرت اس جماعت سے مطمئن

نہیں ہیں" اس طرح کی ایک نہیں، بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلسلہ خواہ کتنا ہی پاک ہو، اور تعلیم خواہ کتنی ہی صحیح ہو، مگر کچھ برائیاں پیری مریدی میں ایسی گہری اُتر چکی ہیں کہ اچھے سے اچھے لوگوں کے مرید بھی ذہنی غلامی، اور رجال کو مدارِ حق بنانے، اور اپنے پیروں کے متعلق فوق الانسانی تصورات رکھنے سے محفوظ نہیں ہیں۔ مولانا اسماعیل شہید اور شاہ عبدالحی صاحب جیسے لوگ سید صاحب کی شخصیت کے بارے میں جو مبالغے کر گئے ہیں وہ ان کے تذکروں میں ملاحظہ فرمائیے۔ نظری حیثیت سے حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تصرف سے زیادہ پاکیزہ تصرف شاید ہی کوئی ہو۔ مگر ان کی شہادت کے بعد ان کی غیبوبت کا عقیدہ اور ظہورِ ثانی کا انتظار اس مطہر سلسلۂ تصوف میں بھی پیدا ہو کر رہا اور بڑے بڑے ذی علم اور صالح مرید اس میں مبتلا ہوئے حتیٰ کہ ایک گروہ آج تک ان کے ظہورِ ثانی کا منتظر ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ کسی طرح تصوف کے اصل مقصد یعنی اخلاص للہ و توجہ الی اللہ کو ایسے طریقوں سے حاصل کیا جائے جو ان خرابیوں سے پاک ہوں۔ اس غرض کے لیے ہم اُن متصوفانہ طریقوں کو ترک کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے نزدیک خرابی کے موجب ثابت ہوئے ہیں، اور جنہیں کوئی صاحب علم صوفی مباح سے زیادہ درجہ دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ان کے بجائے ہم دوسرے ایسے طریقے اس مقصد کے حصول کے لیے اختیار کرنا چاہتے ہیں جو کم از کم اسی درجہ میں مباح تو ہیں ہی، ورنہ ہم تو ان کے متعلق یہ بھی ثابت کرنے کے لیے تیار ہیں کہ ہم نے ان میں سراسر قرآن اور حدیث کا اتباع کیا ہے اور کوئی ایک چیز بھی ایسی اختیار نہیں کی ہے جس کا ماخذ قرآن اور سنت میں موجود نہ ہو۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر فی الواقع یہ لوگ متصوفانہ طریقوں کو محض تدابیر اور مباحات کے درجہ ہی میں رکھتے ہیں اور انہیں کمی بیشی، تغیر، تبدل کے قابل سمجھتے ہیں تو پھر انہوں نے کیوں ہمارے خلاف اس قدر شور و غل برپا کر رکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ہماری رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں، مگر یہ فتوے بازی اور طعن و تشنیع کیوں ہو رہی ہے؟

رائے دہندوں کی فہرست میں خواتین کے نام درج کرنے کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ جب خواتین کو ووٹ کا حق دیا گیا ہے تو ان کے نام تو فہرستوں میں ضرور درج کرائے جانے چاہئیں۔ البتہ ووٹ دینے یا نہ دینے کا انہیں اختیار ہے۔ نام درج کرانے اس لیے ضروری ہیں کہ بالفرض جماعت آپ کے علاقے میں کام کرتی ہے اور آپ کی اور ہماری توقعات کے برخلاف وہ علاقہ بہت جلدی اس حد تک تیار ہو جاتا ہے کہ ہم اسے اپنی انتخابی جدوجہد کے لیے اختیار کر لیتے ہیں۔ اس صورت میں اگر ہمارے بہت سے ووٹ سرے سے درج ہی نہ ہوں تو یہ ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہوگا۔ خواتین کے ووٹ ڈلوانے کے بارے میں جماعت کی مجلسِ شوریٰ نے پچھلے اجلاس میں جو فیصلہ کیا ہے اسے آپ ملاحظہ فرمائیں۔

چند کاروباری صورتوں کا شرعی حکم

سوال:- ہمیں کاروباری معاملات میں چند ایسی صورتوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ جن کے بارے میں پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ براہِ کرم کتاب و سنت کے علم کی روشنی میں ان معاملات کی حقیقت واضح فرمائیں:-

۱- زمیندار یا دیہات کے بیوپاری کپاس کا وزن، نوعیت quality جس مدت میں وہ مال پہنچا دیں گے، اور نرخ طے کر کے سودا کر جاتے ہیں۔ کچھ پیشگی بھی دے دی جاتی ہے۔ زبانی یا تحریری یہ سب کچھ طے ہو جاتا ہے، مال نہیں دیکھا جاتا۔ اور نہ یہ ممکن ہے۔ انہیں شرائط پر ہم کارخانہ دار کو جتنا مال کپاس ہم نے خریدا ہوتا ہے مقررہ مدت کے اندر ہم دینا طے کر لیتے ہیں مگر عموماً کارخانہ دار پیشگی نہیں دیتے۔

۲- بعض اوقات جبکہ ہم نے کوئی مال خریدا ہوا نہیں یعنی کسی مال کا سودا ابھی نہیں کیا ہوتا، نہیں ہوتا پیشگی ہی کارخانہ دار کے ساتھ مال کی کوالٹی، وزن، نرخ وغیرہ طے کر اور مدت طے کر کے سودا کر لیتے ہیں۔ بعد میں مال خرید کر کے ٹھکانے کر دیتے ہیں۔ ان

دونوں صورتوں میں نرخ پہلے مقرر کر لیا جاتا ہے۔

۳۔ کارخانہ دار کو مال بغیر نرخ مقرر کرنے کے سپلائی کرتے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ طے کر لیتے ہیں کہ ہم دو صد یا ہزار من مال دیں گے اور ایک مدت مقرر کر لیتے ہیں کہ اس کے اندر اندر ہم نرخ مقرر کریں گے جس دن ہمیں نرخ اچھا معلوم ہو ہم اسی دن عکس کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات مال پہنچانے کے بعد ہم دو ماہ تک کا وقفہ بھی نرخ مقرر کرنے کے لیے لے لیتے ہیں۔ کارخانہ دار مال کے پہنچنے پر ہمیں کچھ پیشگی یعنی حاضر نرخ کا ۶۰ یا ۶۵ فی صدی ادا کرتا رہتا ہے۔ نرخ مقرر کرنے پر کل رقم ادا ہو جاتی ہے۔

۴۔ اس طرح کے سودے کپاس اترنے پر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو کپاس اترنے سے دو چار ماہ پیشتر ہی ایسے سودے کرنے شروع کر دیتے ہیں۔

جواب:۔ آپ نے کپاس کے سودے کی جو صورتیں بیان کی ہیں ان کے احکام الگ الگ نمبروار بیان کیے جاتے ہیں:۔

صورت اول و دوم میں بیع سلم کی شرائط میں سے ایک اہم شرط نہیں پائی جاتی یعنی یہ کہ سودا طے ہونے کے ساتھ ہی قیمت پوری کی پوری پیشگی ادا ہو۔ یہ بیع سلم کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ چونکہ یہ شرط ان دونوں صورتوں میں مفقود ہے اس لیے یہ معاملات بیع سلم کے حدود سے خارج ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ معاملات اس بنا پر درست ہیں کہ دراصل یہ بیع کے معاملات نہیں ہیں بلکہ معاہدے کے معاملات ہیں۔ یعنی فریقین آپس میں یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک فریق ایک وقت مقرر پر، یا ایک مدتِ مقررہ کے اندر اس قسم کا اتنا مال اس نرخ پر دوسرے فریق کو مہیا کرے گا۔ اور دوسرا فریق یہ عہد کرتا ہے کہ وہ ان شرائط پر اسے خریدیگا۔ اس قسم کا معاہدہ کرنا جائز ہے اور شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی بشرطیکہ معاہدہ کرنے والے معاہدے ہی کی نیت کریں، یہ نہ سمجھیں کہ ایک فریق نے مال بیچا اور دوسرے نے خرید لیا۔

تیسری صورت میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں نرخ کے معاملہ کو معلق رکھا جاتا ہے اور یہ چیز نہ صرف یہ کہ معاہدے کی صحت میں مانع ہے بلکہ اس میں جھگڑے کے اسباب بھی موجود ہیں۔ اس میں اس امر کا امکان ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک نرخ مقرر کرنے کے معاملہ کو ایسے وقت پر ٹالنے کی کوشش کرے جبکہ بازار کا بھاؤ اس کے مفاد کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ اور اس طرح ان کی کشمکش نزاع کی صورت اختیار کرے۔

کپاس اُترنے پر جو سودے کیے جاتے ہیں ان کے معاملہ میں تو صحیح صورت یہ ہے کہ سیدھا سیدھا بیع کا معاملہ ہو، یعنی بائع کے پاس جتنا مال موجود ہو وہ اسے دکھا کر مقرر نرخ پر فروخت کرے، اور مشتری مال کو دیکھ کر طے شدہ نرخ پر اسے خریدے اور اپنے قبضے میں لے لے۔

محرّمات کی حُرمت کے وجوہ

سوال: چند روز سے رفقاء کے درمیان محرمات کے سلسلے میں ایک مسئلہ زیر بحث ہے جو میں ذیل میں تحریر کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ از راہ کرم اس پر روشنی ڈال کر مشکور فرمائیں گے۔

مناکحت کے سلسلے میں ایک عورت اور دوسری عورت میں کیوں امتیاز کیا گیا ہے کہ بعض کو عقد میں لیا جا سکتا ہے اور بعض محرمات کی فہرست میں آتی ہیں؟ اگرچہ ابتدائے انسانیت میں ایسی کوئی قید نظر نہیں آتی ہے جیسا کہ ہابیل اور قابیل کے قصے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ کیا اس قسم کی شادیاں حیاتیاتی مفاسد کا موجب بھی بن سکتی ہیں؟

امید ہے کہ آپ اس کا جواب ترجمان القرآن میں شائع فرمادیں گے تاکہ دیگر حضرات کے لیے بھی استفادہ کا باعث ہو۔

جواب :۔ محرمات کی فہرست میں جن عورتوں کو شامل کیا گیا ہے، ان کے حرام ہونے کی اصل وجہ حیاتیاتی حقائق نہیں ہیں بلکہ اخلاقی اور معاشرتی حقائق ہیں۔ آپ خود غور کریں کہ جس ماں کے شہوانی جذبات بھی اپنے بیٹے سے متعلق ہو سکتے ہوں کیا وہ اتنے پاکیزہ و مطہر جذبات کے ساتھ بیٹے کو پال سکتی ہے جیسے ماں اور بیٹے کے تعلقات میں ہونے چاہئیں؟ اور کیا بیٹا ہوش سنبھالنے کے بعد ماں کے ساتھ وہ معصومانہ بے تکلفی برت سکتا ہے جو ماں اور بیٹے کے درمیان اب ہوتی ہے؟ اور کیا ایک گھر میں باپ اور بیٹے کے درمیان رقابت اور حسد کے جذبات پیدا نہ ہو جائیں گے اگر ماں اور بیٹے کے درمیان ابدی حرمت کی دیوار حائل نہ ہو؟ ایسا ہی معاملہ بہن اور بھائی کا بھی ہے۔ اگر ابدی حرمت ان کے درمیان قائم نہ ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ بھائی بہن ایک دوسرے کے ساتھ معصوم روابط اور شہوات سے پاک محبت اور شبہات سے بالاتر بے تکلفی برت سکتے؟ کیا اس صورت میں بھی یہ ممکن ہوتا کہ والدین اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو سن بلوغ کے قریب پہنچنے پر ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش نہ کرتے؟ اور کیا کوئی شخص بھی کسی لڑکی سے شادی کرتے وقت یہ اطمینان کر سکتا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں سے بچی ہوئی ہو گی؟ پھر اگر خسر اور بہو کے درمیان، اور ساس اور داماد کے درمیان ابدی حرمت کی دیواریں حائل نہ کر دی جاتیں تو کس طرح ممکن تھا کہ باپ اور بیٹے اور ماں اور بیٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ رقیبانہ کشمکش میں مبتلا ہونے اور ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھنے سے بچ جائیں؟ اس پہلو پر اگر آپ غور کریں تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ شریعت نے کن اہم اخلاقی و معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر ان تمام مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کے لیے حرام کر دیا ہے جن کے درمیان ایک گھر، ایک خاندان اور ایک دائرہ معاشرت کے اندر قریب ترین روابط اور بے تکلف روابط فطرۃً ہوتے ہیں اور معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ہونے چاہئیں۔ بیٹے اور بیٹیاں پل ہی نہیں سکتیں اگر ماں اور باپ دونوں اس طرف سے بالکل مطمئن نہ ہوں کہ ان میں سے کسی کا بھی کوئی شہوانی علاقہ اپنی اولاد کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک

ہی گھر میں لڑکوں اور لڑکیوں کا پلنا غیر ممکن ہو جائے اگر بہن کے معاملہ میں بھائیوں کے درمیان اور بھائی کے معاملہ میں بہنوں کے درمیان شہوانی رقابتیں پیدا ہونے کا دروازہ قطعی طور پر بند نہ ہو۔ خالائیں اور پھوپھیاں اور چچا اور ماموں اگر شبہ سے بالاتر نہ کر دیے جائیں تو بہن اپنی اولاد کو اپنے بھائی بہنوں سے، اور بھائی اپنی اولاد کو اپنے بھائی بہنوں سے بچانے کی فکر میں لگ جائیں۔

خنزیر اور درندوں کے گوشت کی حرمت کیوں؟

سوال:- قرآن نے چند چیزیں حرام کیوں قرار دی ہیں؟ طبی نقطۂ نگاہ سے یا کسی اور وجہ سے؟ ان میں کیا نقصانات ہیں؟ خنزیر کو خاص طور پر نام لے کر کیوں شدت سے حرام قرار دیا گیا ہے؟ کیا یہ سب سے زیادہ مضر حیوان ہے؟ چیرنے پھاڑنے والے جانور اور جونک وغیرہ کیوں حرام قرار دیے گئے ہیں؟

جواب:- قرآن میں جن چیزوں کو کھانے سے منع کیا گیا ہے اُن کی حرمت میں ممکن ہے کہ ضمناً کچھ لحاظ ان کے طبی نقصانات کا بھی ہو، مگر اصل وجہ حرمت طبی نہیں بلکہ اخلاقی اور اعتقادی ہے بعض چیزیں اعتقادی بنیادوں پر حرام کی گئی ہیں جیسے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ اور بعض چیزیں اخلاقی نقصانات کی وجہ سے حرام کی گئی ہیں، جیسے خنزیر۔ ان چیزوں کے اخلاقی نقصانات کا ہمیں پورا علم نہیں ہے، مگر کسی حد تک اپنے مشاہدات کی بنا پر ہم اُن کو جان سکتے ہیں۔ مثلاً خنزیر کے متعلق دنیا کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس کا گوشت نہایت بے حیائی پیدا کرنے والا ہے۔ جو قومیں اسے کثرت سے استعمال کرتی ہیں اُن کے اخلاقی حالات اس پر گواہ ہیں۔ دنیا میں شاید خنزیر ہی ایک ایسا جانور ہے جس کی ایک مادہ کے گرد بہت سے نر جمع ہو جاتے ہیں اور باری باری سے ایک دوسرے کے سامنے اس کے ساتھ جفتی کرتے ہیں[1]۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ بے حیائی

---

[1] اس معاملہ میں غالباً کتا اس کی ہمسری کر سکتا ہے۔ (ن۔ ص)

کی یہ خاص نوعیت کن قوموں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جن قوموں کے آدابِ مجلس (Ettiquette) میں یہ چیز داخل ہو کہ مجلس میں ایک شخص کی بیوی لازماً دوسرے شخص کے پہلو میں بیٹھے، اور بال روم میں اپنی بیوی کے ساتھ خود ناچنا تنگ دلی کی علامت ہو اور اسے دوسروں کے ساتھ سینے سے سینہ ملا کر ناچنے کے لیے چھوڑ دینا فراخ دلی اور مروت کی دلیل سمجھی جائے۔ ان کے اس اخلاقی تخیل کا ماخذ اگر آپ تلاش کریں گے تو بعید نہیں کہ اس کا سراغ اس جانور کی جبلت ہی میں آپ کو مل جائے جس کا گوشت ان کے ہاں کثرت سے کھایا جاتا ہے۔ اسی طرح درندہ جانوروں کے متعلق بھی ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ ان کا استعمال خونخواری پیدا کرنے والا ہے۔ بہتے ہوئے خون یا بہلائے ہوئے خون کے استعمال سے بھی درندگی اور قساوت کا پیدا ہونا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔

کیا یہ تنابز بالالقاب ہے؟

سوال:۔ آپ کی جماعت کا دعویٰ ہے کہ وہ اقامتِ دین کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ آپ اور آپ کی جماعت ہمیشہ جماعت احمدیہ کو "مرزائی جماعت" یا "قادیانی جماعت" کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ حالانکہ یہ امر دیانت کے بالکل خلاف ہے کہ کسی کو ایسا نام دیا جائے جو اُس نے اپنے لیے نہیں رکھا۔

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے اپنی جماعت کا نام "جماعت احمدیہ" رکھا ہے اور اُن کی جماعت کے افراد بھی اپنے آپ کو "احمدی" کہتے ہیں۔ مگر اُن کے مخالفین تعصب کی وجہ سے انہیں "مرزائی" یا "قادیانی" پکارتے ہیں۔ کیا دینِ اسلام میں یہ جائز ہے؟ اگر یہ جائز ہے تو کیا آپ یہ پسند فرمائیں گے کہ آپ کی جماعت کے افراد کو "مودُودیے" کہا جائے۔ اگر آپ یہ پسند نہیں فرماتے تو

پھر آپ اور آپ کی جماعت دوسروں کے لیے ایسا کیوں پسند کرتی ہے؟

واضح رہے کہ آپ نے ترجمان القرآن جلد ۳۵، ۳۶ عدد ۵، ۶، ۱، ا کے صفحہ ۱۴۶ پہ تحریر فرمایا ہے:

"میں اپنی حد تک یقین دلاتا ہوں کہ مجھے کبھی اپنی غلطی تسلیم کرنے میں نہ تامل ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا، بشرطیکہ میری غلطی دلائل سے ثابت کی جائے نہ کہ سب و شتم سے۔"

جواب: کسی جماعت کو اس کے معروف نام سے یاد کرنا، جبکہ فی الواقع اس میں توہین کا بھی کوئی پہلو نہ ہو، ناجائز نہیں ہے۔ احمدی حضرات نے اپنا نام "احمدی" پسند کیا ہے، یعنی وہ اپنے آپ کو بانیٔ سلسلہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ عرفِ عام میں ان کا نام "قادیانی" رائج ہو چکا ہے، یعنی عوام الناس ان کو بانیٔ سلسلہ کے وطن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں تذلیل و تحقیر کا کونسا پہلو ہے اور یہ خلافِ دیانت کیوں ہے۔ اگر یہ خلافِ دیانت ہے تو وہ سارے ہی عرف ناجائز اور خلافِ دیانت قرار پائیں گے جو لوگوں میں رائج ہیں۔

جماعت اسلامی کے افراد کو "مودودیے" کہنے پر ہمیں اس لیے اعتراض ہے کہ ہم اپنے مسلک اور نظام کو کسی شخص خاص کی طرف منسوب کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں۔ "مودودی" تو درکنار ہم تو اس مسلک کو "محمدی" کہنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ یہ تو "اسلام" ہے جس کے مُوجد ہونے کا شرف کسی انسان کو حاصل نہیں۔ اس لیے اسے کسی انسان کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ ہمیں "نوحیے" یا "ابراہیمیے" کہیں گے تب بھی ہمیں وہی اعتراض ہوگا جو "مودودیے" کہنے پہ ہے۔ بخلاف اس کے مرزا صاحب اور ان کے متبعین نے اپنے مسلک و جماعت کو خود ہی ایک شخص خاص کی طرف منسوب کیا ہے، اور عوام نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اس شخص کے بجائے اس کے وطن کی طرف انہیں منسوب کر دیا۔ یہ کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ سلسلۂ چشتیہ بھی بانیٔ سلسلہ کے بجائے ان کے وطن کی طرف

منسوب ہو کر مشہور ہوا ہے یہی معاملہ سلسلۂ سہروردیہ، سنوسیہ، شطاریہ وغیرہ کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں ان سلسلوں کی توہین کا کوئی پہلو ہے۔ رہا لفظ "مرزائی" تو البتہ اسے میں پسند نہیں کرتا اور میں نے خود کبھی اسے استعمال نہیں کیا، اِلّا یہ کہ کسی نے اپنے سوال میں یہ لفظ استعمال کیا ہو اور میں نے اس کا جواب دیتے ہوئے حکایۃً اسے استعمال کر لیا ہو۔

خلاصۂ رُوداد مجلسِ شُوریٰ جماعت اسلامی پاکستان

منعقدہ یکم تا ۴ ستمبر ۱۹۵۱ء بمقام لاہور

ملک کے موجودہ حالات اور بعض دوسرے ضروری مسائل پر غور اور مشورے کے لیے امیر جماعت اسلامی پاکستان مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس آغاز ستمبر ۱۹۵۱ء میں طلب کیا تھا۔ اس اجلاس میں بجز خان سردار علی خاں صاحب (صوبہ سرحد) کے، جو بیماری کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے، مجلس کے تمام ارکان شریک ہوئے۔ یہ اجلاس یکم سے ۴ ستمبر تک جاری رہا۔ کل ۹ اجلاس منعقد ہوئے۔ ان میں مجلس نے حسب ذیل اہم قراردادیں پاس کیں:۔

ملک کی موجودہ نیم جنگی صورتِ حال — مجلس نے اس صورتِ حال کے ہر پہلو پر اور اس کے تمام ممکن نتائج پر تفصیل کے ساتھ غور کیا اور اس پالیسی اور پروگرام سے کامل اتفاق کا اظہار کیا جسے امیر جماعت نے ملک میں جنگی حالات پیدا ہونے کے بعد جماعت اسلامی شہر لاہور کے ہفتہ وار اجتماعات منعقدہ ۲۲، ۲۹ جولائی اور ۵ راگست ۱۹۵۱ء میں تقاریر کی صورت میں پیش کیا ہے۔

نوٹ:۔ یہ تینوں تقریریں "فریضہ دفاع پاکستان اور اس کے ادا کرنے کا طریقہ" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں اور دفتر جماعت اسلامی شہر لاہور نزد تھانہ گوالمنڈی، لاہور سے مل سکتی ہیں۔

سالانہ اجتماعِ عام — مجلسِ شوریٰ نے بالاتفاق طے کیا کہ:۔

(۱) جماعت کا آئندہ سالانہ اجتماع کراچی شہر میں ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء (مطابق ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ صفر ۱۳۷۱ھ) بروز ہفتہ، اتوار، پیر، منگل منعقد کیا جائے۔

(۲) اس اجتماع میں مغربی پاکستان کے تمام مرد ارکان لازماً شریک ہوں اِلّا یہ کہ کوئی عذر شرعی مانع ہو۔ عذر کی بنا پر شریک نہ ہو سکنے کی صورت میں اجلاس سے پہلے اپنی مقامی جماعت یا اپنے ضلع کی جماعت کے امیر کے پاس اپنی معذرت بھیجنی ضروری ہوگی۔ مشرقی پاکستان کے ارکان اور خواتین ارکان کے لیے شرکت لازم نہیں ہوگی۔

(۳) کراچی سے باہر کے شرکاءِ اجتماع کے لیے قیام اور طعام کا انتظام جماعت کی طرف سے کیا جائے۔ مصارفِ طعام کے لیے فی کس ۵ روپے کے حساب سے وصول کیے جائیں، اِلّا یہ کہ کوئی شخص اپنے کھانے کا انتظام بطور خود کرنا چاہے۔ ارکان جماعت کے لیے اجتماع کے چاروں دن جماعت کی قیام گاہ میں رہنا بہر حال لازم ہوگا۔

(۴) اس اجتماع میں سب سے اہم کام جماعت کے نئے دستور کو پاس کرنا ہے۔ دستور کا مسودہ ماہ اکتوبر کے آغاز میں تمام ارکان کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ جو لوگ مجوزہ دستور میں کوئی ترمیم پیش کرنا چاہیں ان کی تجویز کردہ ترمیمات یکم نومبر تک مرکزی دفتر میں پہنچ جانی چاہئیں۔

(۵) نیز اس اجتماع میں جو ارکانِ جماعت کوئی تجویز پیش کرنا چاہیں، یا جماعت کی پالیسی، نظم و نسق، یا تحریک اور اس کے کارکنوں سے متعلق کوئی سوال پوچھنے یا کوئی اعتراض پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ بھی اپنی تجاویز، سوالات یا اعتراضات یکم نومبر تک مرکزی دفتر میں پہنچا دیں۔

(۶) مصارفِ اجتماع کے لیے مختلف حلقوں کے ذمے حسب ذیل رقوم عائد کی گئی ہیں:۔

حلقۂ سندھ و کراچی ساڑھے تین ہزار۔ حلقۂ بہاولپور دو ہزار۔ حلقۂ ملتان ڈیڑھ ہزار۔ حلقۂ لائل پور ڈیڑھ ہزار۔ حلقۂ لاہور ایک ہزار۔ حلقۂ گوجرانوالہ ۵ سو۔ حلقۂ راولپنڈی ۵ سو۔ ان میں سے حلقۂ سندھ و کراچی کے سوا باقی تمام حلقے اپنے ذمہ کی رقمیں ۱۵ اکتوبر ۵۱ء تک مرکزی بیت المال میں داخل کر دیں۔

خلاف ضابطہ افعال پر کارروائی | یہ مسئلہ ایک عرصہ سے حل طلب تھا کہ اگر جماعت کا کوئی رکن یا کارکن کوئی خلاف ضابطہ و اخلاق کام کر بیٹھے تو اس پر کیا کارروائی کی جائے؟ ظاہر ہے کہ نہ تو ہر قصور پر جماعت سے اخراج کو صحیح کہا جا سکتا ہے اور نہ ہر قصور کے لیے محض تنبیہ و سرزنش کافی ہو سکتی ہے۔ اس مسئلہ پر کافی غور کرنے کے بعد مجلس شوریٰ نے حسب ذیل فیصلہ کیا:-

(۱) آئندہ جب کسی رکن جماعت سے جماعت کے نظام کے خلاف، یا شریعت کے خلاف یا اخلاق عامہ کے خلاف کسی قصور کا ارتکاب ہو تو اسے نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اس کا فوراً نوٹس لیا جائے۔

(۲) اس کے بعد پہلا اقدام یہ ہونا چاہیے کہ اسے تنبیہ و سرزنش اور توبہ و اصلاح کی تلقین کی جائے۔

(۳) اگر قصور کی نوعیت یا حالات جن میں اس کا ارتکاب کیا گیا ہے ایسے ہوں کہ اس کے لیے صرف تنبیہ و سرزنش کافی نہ ہو تو کفارہ کی کوئی مناسب صورت مثلاً صدقہ، نفل نماز، نفل روزہ یا اسی طرح کی کوئی عبادت یا دینی خدمت تجویز کی جائے، اور بالعموم طریقہ یہی ہونا چاہیے کہ یہ کفارہ خود اسی شخص سے تجویز کرایا جائے جس نے قصور کا ارتکاب کیا ہو، اور یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی جائے کہ دراصل یہ سزا نہیں ہے بلکہ ایک کفارہ ہے تاکہ اس کے نفس کی اصلاح ہو اور اللہ کے ہاں اس کا قصور معاف ہو سکے۔ نیز اگر کفارہ صدقہ کی شکل میں تجویز ہو تو اسے جماعت کے بیت المال میں داخل نہ کیا جائے بلکہ وہ شخص خود اسے براہ راست مساکین میں تقسیم کرے۔

(۴) تمام ایسے معاملات کا ضلعی جماعتوں کے دفاتر میں مکمل ریکارڈ رکھا جائے جس سے معلوم ہو سکے کہ کیا قصور کیا گیا، کس نے کیا، کب کیا اور اس پر کیا کارروائی کی گئی۔

(۵) اگر کوئی قصور تنبیہ و سرزنش کی حد سے زیادہ سخت نوعیت کا ہو تو اس کی رپورٹ امیر ضلع کے پاس کی جائے۔ امرائے ضلع کو چاہیے کہ اگر وہ قصور کی نوعیت زیادہ شدید پائیں تو اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس معاملہ کو امیر حلقہ کے علم میں لائیں اور ان سے اپنے تجویز کردہ اقدام کے بارے میں مشورہ کریں۔

(۶) امرائے حلقہ اپنی سہ ماہی رپورٹوں میں مرکز کو اس امر کی اطلاع دیتے رہیں کہ ان کے حلقوں میں

کیا کیا قصور ہوئے اور ان پر کیا کارروائی کی گئی۔

(۷) جہاں کسی شخص سے کوئی مالی نوعیت کا قصور سرزد ہو، اُس پر کفارہ عائد کرنے کے ساتھ یہ بھی لازم کیا جائے کہ وہ اس نقصان کی تلافی کرے جو اس نے جماعت، کو یا اپنے کسی بھائی کو پہنچایا ہے۔

چند شرعی مسائل (۱) درآمد اور برآمد کی تجارت میں تاجروں کو لیٹر آف کریڈٹ پر جو سُود مجبوراً دینا پڑتا ہے اُس کی شرعی حیثیت پر مجلس شوریٰ نے غور کیا لیکن وہ اپنے اس اجلاس میں کسی قطعی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ اس لیے اس مسئلے کو آئندہ اجلاس کے لیے ملتوی کیا گیا۔

(۲) مجلس شوریٰ نے اس مسئلہ پر بھی غور کیا کہ اب جب کہ سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کے بارے میں حکومت کی پالیسی اور ٹیکس وصول کرنے والے حکام کے ظالمانہ رویہ نے عام طور پر یہ صورت پیدا کر دی ہے کہ تجارت پیشہ لوگ یا تو غلط حساب رکھیں یا ان حکام کو برابر رشوت دیتے رہیں یا پھر کاروبار بند کر دیں، تو کیا ان حالات میں تجارت پیشہ ارکانِ جماعت کو اس بارے میں کوئی ڈھیل دی جا سکتی ہے؟ مجلس نے اس صورت حال اور تاجروں کی ساری مجبوریوں پر غور کرنے کے بعد بالاتفاق فیصلہ کیا کہ اس بارے میں امیر جماعت نے رسالہ ترجمان القرآن بابت ماہ رمضان ۱۳۷۰ھ کے صفحہ ۵۸ پر جس پالیسی کا اظہار کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ ارکانِ جماعت سے اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرائی جائے۔

علیحدہ ہونے والے ارکان کے وجوہ علیحدگی پر غور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب (لائل پور) کی اس تجویز کو مجلس شوریٰ نے بالاتفاق قبول کر لیا کہ جن لوگوں کو جماعت سے علیحدہ کیا جاتا ہے یا جو خود علیحدہ ہوتے ہیں، ان کی علیحدگی کے وجوہ مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کئے جایا کریں اور مجلس اپنے ہر اجلاس میں گذشتہ اجلاس سے اُس وقت تک علیحدہ ہونے والے لوگوں کے وجوہ علیحدگی کا جائزہ لے لیا کرے۔

خواتین کی تربیت کا مسئلہ جماعت کی خواتین کارکنوں کی تربیت کی ضرورت مجلس خود بھی ایک مدت سے محسوس کر رہی تھی اور حلقہ خواتین کی طرف سے بھی اس کے لئے بار بار تقاضا کیا جاتا رہا ہے۔ مجلس نے اپنے اس اجلاس میں اس مسئلہ پر بھی غور کیا اور فیصلہ کیا کہ جہاں جہاں بھی ممکن ہو تربیت گاہوں میں خواتین کے

لیے بھی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ نیز مقامی جماعتوں کے ہفتہ وار اجتماعات میں بھی جہاں جہاں ممکن ہو، عورتوں کے لیے پردے کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ بھی ان اجتماعات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

مرکزی الیکشن بورڈ | صوبہ سرحد اور سندھ میں عام انتخابات کے پیش نظر مجلس نے حسب ذیل حضرات پر مشتمل مرکزی الیکشن بورڈ مقرر کر دیا ہے تاکہ وہ انتخابات سے متعلق جملہ معاملات کا بروقت فیصلہ کر دیا کرے :-

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت۔ (۲) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی (۳) ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز۔ (۴) نعیم صدیقی صاحب۔ (۵) چوہدری محمد اکبر صاحب۔ (۶) طفیل محمد قیم جماعت۔

دعوت دین اور اس کا طریق کار

از مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا اصلاحی نے اس کتاب میں ایک طرف تو موجودہ طریقہ تبلیغ کی خامیوں کو واضح کیا ہے' اور دوسری طرف انبیا علیہم السلام کے طریقہ تبلیغ' طریقہ تربیت اور دعوت دین کے مکمل طریق کار پر مفصل اور مدلل روشنی ڈالی ہے۔

جو لوگ اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پھر زندہ و کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے اسی طریقہ پر کام کرنے کو صحیح سمجھتے ہیں جو انبیائے کرام نے اپنے اپنے زمانے میں ہدایت خداوندی کے تحت اختیار کیا تھا، اس کتاب میں اپنے لئے بہت کچھ پائیں گے، اور اس کے مطالعے سے محسوس کرینگے کہ ان کی راہ کے بہت سے پتھر ہٹ گئے ہیں اور بہت سی تاریک راہیں روشن ہو گئی ہیں۔

پاکستان — جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اور جسکو قرارداد مقاصد کے ذریعہ اسلام کے نظام زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے باشندے اپنے اندر ان صفات کو پرورش دیں جو اسلام کی دعوت کے لئے ضروری ہیں، تا کہ وہ اسلام کو صرف اپنے ملک میں حاکم و حاوی بنانے کی جد و جہد کریں بلکہ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے لئے بھی مشعل راہ بن سکیں۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب اس مقصد میں مدد گار ثابت ہو گی

جلد شائع ہو رہی ہے

ارتداد کی سزا

اسلامی قانون میں

از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتابچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو مولانا نے محترم نے وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں لکھے تھے۔

مسلمانوں نے مغرب سے مرعوب ہو کر اسلام کے جن مسائل کو شبہہ اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھا اور شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں نے جنکو اسلام سے خارج ہی سمجھنا شروع کر دیا ان مسائل میں سے ایک مسئلہ ارتداد کا ارتکاب کرنے والے کی سزا سے بھی متعلق تھا۔

مولانا مودودی نے اس مسئلہ پر پوری مدلل روشنی ڈالی ہے اور اس کا مطالعہ علم سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

ملنے کا پتہ: جلد شائع ہو رہی ہے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ۔ لاہور۔ پاکستان

سرورق رپن پریس' لاہور میں چھپا